معارف

فروری ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپیے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپیے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپیے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپیے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپیے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپیے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۵ ماہ جمادی الآخر ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۲۰ء عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

کون سوچ سکتا تھا کہ جامعہ کے طلبہ کے خلاف پولیس کا تشدد ایسے سلسلہ واقعات کا باعث بن جائے گا جو ایک انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔اس کے نتیجہ میں جو بیداری اور تبدیلی ملک کے حالات میں آئی ہے،اس کے روح پرور مناظر ہر چہار طرف نظر آرہے ہیں۔خاص طور سے نوجوانوں اور طلبہ اور طالبات پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ ملک کے مستقبل کے لیے بہت خوش آئند ہیں اور ایک نئی صبح امید کی نوید ہیں۔جس بے ساختگی سے اس انقلاب نے پورے ملک میں نوجوان نسل کو اور خاص طور سے اعلیٰ تعلیم گاہوں کے طلبہ اور طالبات کو اپنی گرفت میں لے لیا،اس کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا شاید نامناسب نہ ہو کہ ملک میں اس وقت پائے جانے والے حالات کی وجہ سے اس قسم کے انقلاب کے لیے فضا تیار تھی اور بے چینی اور اضطراب کا شدید احساس پہلے سے موجود تھا اور اس کو صورت پذیر ہونے کے لیے صرف ایک محرک کی ضرورت تھی۔جامعہ میں پیش آنے والے واقعات نے وہ محرک فراہم کر دیا۔اس سلسلہ میں اگر کوئی کمی رہ گئی تھی تو اس کو علی گڑھ اور جے این یو کے واقعات نے پورا کر دیا۔شہریت ترمیمی بل کے مخصوص پس منظر میں ان واقعات نے ملک کے حساس طبقات کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور حالات کے بہاؤ کو روکنے کی ناگزیر ضرورت کا احساس کھل کر سامنے آگیا۔اس کے ردّعمل میں ملک کے طول وعرض میں جو کچھ ہوا وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی تھا۔ اس کو آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ اور تاریخ ساز واقعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا لمحہ تھا جب کسی ملک کی ایک نئی سمت سفر متعین ہوتی ہے اور اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔اس کے عواقب اور مضمرات کو مکمل طور پر سامنے آنے میں تو شاید ابھی وقت لگے گا البتہ جزوی طور پر اس کے جو نتائج نکلے ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔یہ جدوجہد دستور کے الفاظ اور اس کی روح کو بچانے کے لیے شروع ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں ہندوستانی قوم پرستی،حب الوطنی اور دستور سے وابستگی کا پہلو بہت نمایاں ہے۔جتنا اور جس قدر گزشتہ ڈیڑھ مہینہ کے عرصہ میں ملک کے گوشے گوشے میں دستور پڑھا،سنا اور سمجھا گیا ویسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔بے شمار لوگوں کے ہاتھوں میں دستور کی کاپیاں ہیں۔مظاہروں میں خاص طور سے اس کی تمہید (Preamble) کو پڑھا اور بغور سنا جاتا

ہے۔تمہید کو دراصل دستور کے خلاصہ اور روح کی حیثیت حاصل ہے۔اس کے مندرجات سے جس قدر واقفیت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر یہ احساس بھی بڑھتا جاتا ہے کہ ملک کا آئین خطرے میں ہے اور اس کی حفاظت ہر محب وطن شہری کا فرض ہے۔اس حب الوطنی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس سلسلے کے تمام دھرنے اور مظاہرے قومی پرچم کے سایہ میں انجام دیے جارہے ہیں جو ملک کی آزادی کی علامت ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ملک میں ترنگے کی اتنی مانگ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تو بیجا نہ ہوگا۔ان مظاہروں اور دھرنوں میں قومی پرچم کا ایک سیلاب سا نظر آتا ہے۔ بچے اپنے رخساروں پر ترنگے کو رنگے ہوئے بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں ۔ ان مواقع پر قومی ترانہ بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر امبیڈکر کی تصویریں بھی کثرت سے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جامعہ،شاہین باغ اور اس نوعیت کے ملک بھر میں پھیلے ہوئے دھرنے قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کو پروان چڑھانے کے سلسلہ میں ٹریننگ سینٹرز کا کام کر رہے ہیں، جہاں خاص طور سے نئی نسل کو دستور کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور ان کے دل و دماغ میں حب الوطنی کے جذبات کو جاں گزیں کرنے کی کوشش بھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ اس انداز میں تحریک کے آغاز کا افتخار جامعہ کے طلبہ کو حاصل ہے۔

جن حالات میں جامعہ کی تاسیس ہوئی اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس کی تاسیس تحریک آزادی کے زیر اثر ہوئی۔اس کے موسسین تحریک آزادی کے اساطین میں شامل تھے۔مہاتما گاندھی کو جامعہ سے گہرا تعلق خاطر تھا اور وہ اس کی تعمیر وترقی میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جامعہ قومی تحریکات میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔چنانچہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے موجودہ بحران میں وقت کے تقاضوں کو پہچانا اور اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ وہ اس درخشاں روایت کے صحیح جانشین اور امین ہیں اور اپنے بانیوں کی روح کو شاد کام کیا۔شہریت ترمیمی قانون کے خلاف مظاہرہ میں پولیس کے تشدد کے سامنے طلبہ اور طالبات نے جس ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا وہ ایک مثال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔جامعہ کے احتجاج کی خاص بات یہ ہے کہ طاقت کے بے مہار استعمال کے باوجود جس سے ان کے جسم وجان

دونوں زخمی تھے، طلبہ نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اپنی سمجھ بوجھ اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے اس قانون کے خلاف ایک ایسی طاقتور تحریک کی بنیاد رکھ دی جس سے بے شمار لوگوں کو رہنمائی بھی ملی ہے اور حوصلہ بھی۔ اب ڈیڑھ مہینہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی انداز اور آہنگ سے جاری ہے اور اس کے ہر پہلو کی تنظیم میں حسن سلیقہ نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دھرنا ایک اوپن اسکول کی شکل اختیار کر چکا ہے جہاں طلبہ خود بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کے الگ الگ دائرے ہیں اور سب بنیادی تصور سے پوری طرح مربوط ہیں۔ مثال کے طور پر وہاں ایک آرٹ گیلری ترتیب دی گئی ہے جس کا عنوان ہے "ہم دیکھیں گے"۔ اس میں طلبہ کے خلاف تشدد اور یونیورسٹی کے احاطہ میں پولیس کی دراندازی سے متعلق تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تصویریں جھوٹ نہیں بولتیں۔ ایک تصویر جتنے موثر انداز میں ایک بات دیکھنے والوں تک پہنچا دے گی اس کے لیے کئی صفحات کی تحریر کی ضرورت ہوگی۔ پولیس نے لائبریری پر حملہ کیا تو طلبہ نے سڑک پر لائبریری قائم کر دی جس کا فیض عام ہے۔ اس کا عنوان ہے "ریڈ فار ریوالیوشن"۔ وہاں لکڑی کی ایک کوٹھری بھی بنی ہوئی ہے جو ان حراستی کیمپوں کا استعارہ ہے جہاں ان لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو اپنی شہریت ثابت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہاں فطری طور پر ایک ڈائس کا بھی اہتمام ہے جہاں سے اہم شخصیات طلبہ کو خطاب کرتی ہیں۔ طلبہ خود اس قانون اور اس کے متعلقات پر گفتگو کرتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں، نظمیں پڑھی جاتی ہیں اور مختلف ذرائع سے اس پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح اس تحریک کو مضبوط کرنے اور اس کو آگے بڑھانے کے مقصد سے کسی نہ کسی پروگرام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ کے در و دیوار پر بنی ہوئی گریفٹی، پلے کارڈ اور اشتہار سے نہ صرف وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کی فنکارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے بلکہ نہایت موثر انداز میں اس تحریک کا پیغام بھی دیکھنے والوں تک پہنچتا ہے۔ جامعہ کے طلبہ جس کامیابی اور سلیقہ سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر علی گڈھ میں بھی احتجاج کے ساتھ تعلیمی سرگرمیاں بھی چلتی رہتیں۔

جامعہ سے تھوڑی ہی دور پر اور جامعہ نگر کے وسیع تر علاقہ میں شاہین باغ واقع ہے۔

۱۵؍دسمبر سے پہلے اس آبادی کی اپنی کوئی خاص شناخت نہیں تھی۔ دوسرے رہائشی علاقوں کی طرح وہ بھی ایک رہائشی علاقہ ہے جہاں ابھی تک کئی شہری سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ ایسے رہائشی علاقوں کی اپنی کچھ معاشرتی روایات اور ضوابط ہوتے ہیں جن کے مطابق وہاں کی زندگی منضبط اور منظم ہوتی ہے۔ یہ روایات اور ضوابط وہی ہیں جو عام طور پر کھاتے پیتے مسلمانوں کی آبادیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۵؍دسمبر کی شب میں جب جامعہ کے طلبہ کے خلاف پولیس کے تشدد کی خبر وہاں پہنچی تو یہ سب کچھ جیسے بدل سا گیا اور شاہین باغ ایک بالکل نئے تجربے سے دوچار ہوگیا جو کسی بھی طرح ایک انقلاب سے کم نہیں تھا۔ جب جامعہ کے طلبہ کی ہمدردی اور ملی غیرت وحمیت کے زیر اثر چند خواتین سڑک پر آکر بیٹھ گئیں تو ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ وہ ملک کی تاریخ میں ایک انقلاب کے ہراول دستہ کا کردار ادا کررہی ہیں۔ جب علاقہ میں یہ خبر عام ہوئی تو وہاں رہنے والی خواتین جس طرح بغیر کسی تحریک اور کوشش کے اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں اور اس کارواں میں شامل ہوتی چلی گئیں، اس کی ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی اور مثال نہیں۔ یہ ایک بالکل انوکھا اور عجوبہ روزگار واقعہ ہے۔ گھروں کی محفوظ چہاردیواری کے اندر رہنے کی عادی ان خواتین کے لیے کھلے میدان میں آسمان کے نیچے اس طرح غیر معینہ مدت کے لیے اقامت گزین ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ خواتین اس سے پہلے اس طرح کے کسی تجربہ سے دوچار نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں گھریلو خواتین بھی شامل ہیں اور ملازمت پیشہ بھی۔ ان میں اپنی ماؤں کے ساتھ چھوٹے بچے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں نوزائیدہ بچے بھی شامل ہیں۔ ان کو ان دوگونہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں گھر کے دوسرے افراد کا بھی بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اس کے باوجود اس کے سخت تقاضوں کو پورا کرنا آسان نہیں۔ لیکن انہوں نے اس غیر معمولی صورت حال کا جس عزم وحوصلہ سے سامنا کیا اور ڈیڑھ مہینہ گزر جانے کے بعد بھی کررہی ہیں وہ ناقابل بیان ہے اور ان کا عزم ناقابل شکست۔ اس جدوجہد کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے سے پہلے وہ وہاں سے اٹھنے کے لیے کسی بھی طرح تیار نہیں ہیں۔ اس طویل مدت میں وہ وقت بھی آیا جب دہلی کی سردی نے ایک صدی سے زیادہ کا ریکارڈ توڑ دیا۔ وہ وقت بھی آیا جب اس شدید سردی میں بارش بھی شروع ہوگئی۔ وہ وقت بھی آیا جب دھرنا اٹھانے کے لیے پولیس کا دباؤ اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا لیکن آفرین ہے شاہین باغ کی ان شاہین صفت خواتین کو کہ ان سب ناقابل برداشت اور مشکل ترین

حالات میں بھی نہ تو ان کے اندر کوئی کمزوری آئی اور نہ ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہین باغ مرجع خلائق بنتا چلا گیا۔ ان کے ساتھ کھڑے ہونے، ان کا حوصلہ بڑھانے اور ان کے عزم و ہمت سے حوصلہ حاصل کرنے کے مقصد سے وہاں آنے والوں کی تعداد کبھی کبھی بہت بڑھ جاتی ہے لیکن وہاں کا انتظام اس خوبی سے چلتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی بدانتظامی اور افراتفری نظر نہیں آتی۔ یہاں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سبھی آتے ہیں اور یہاں وطن عزیز کا ہر رنگ نظر آتا ہے۔ اسے چھوٹا ہندوستان کہہ لیجیے۔ یہاں باہمی یگانگت، ہمدردی، یکجہتی اور رواداری کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب تک اس کو ناکام کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ چشم فلک نے ایسا منظر شاید ہی کبھی دیکھا ہو جو شاہین باغ میں گذشتہ ڈیڑھ مہینہ سے نظر آرہا ہے۔ ان بہادر خواتین نے اپنی بے مثال قربانیوں سے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی نظریں ان کے اوپر مرکوز ہیں۔ شاہین باغ کی دادیوں کی شہرت تو دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ شاہین باغ کی پیروی میں ملک کے طول و عرض میں ہر روز ایک نیا شاہین باغ جنم لے رہا ہے اور ان بے شمار شاہین باغوں میں سے ہر شاہین باغ عزم و ہمت کی ایک نئی داستان رقم کر رہا ہے۔ اس کے اثرات کہاں کہاں اور کس کس شکل میں پڑ رہے ہیں اس کا صحیح طور اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ اس کا تجزیہ تو مستقبل کا مورخ ہی طے کرے گا۔

اپنے حقوق کے لیے پرامن مظاہرہ ایک جمہوری ملک کے شہریوں کا حق ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ہر نوع کے بے شمار مظاہرے ہوتے رہے ہیں لیکن اس وقت ملک کے گوشے گوشے میں شہریت ترمیمی بل کے خلاف جو مظاہرے ہو رہے ہیں ان کی شان اور انداز ہی الگ ہے۔ ان کی کچھ ایسی خصوصیات جو ان کو دوسرے مظاہروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کو ان مظاہروں کی اولیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے مختلف حصوں میں بیک وقت وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ان میں کمی کے بجائے اور اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ان مظاہروں کے پیچھے نہ کوئی منصوبہ بندی ہے اور نہ قیادت۔ چنانچہ جہاں کہیں یہ مظاہرے ہوتے ہیں ان کی تنظیم اور کوآرڈی نیشن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ لوگ

سامنے آجاتے ہیں اور یہ بالعموم نوجوان ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ نوجوان ہی اس کے روح رواں ہیں اور انہی کی توانائی ان کو آگے بڑھا رہی ہے۔ چنانچہ اس تحریک کی کوئی مرکزی لیڈرشپ نہیں ہے۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ لیڈرشپ کا فقدان ان مظاہروں کی کمزوری کے بجائے ان کی طاقت کا سبب ہے۔ خاص طور سے اس پورے منظرنامے سے سیاسی لیڈروں کی غیر موجودگی اس تحریک میں عوامی اعتماد میں اضافہ کی باعث بنی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس میں ملی قیادت بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ اب پرانی نسل کو شاید نئے حالات کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ یہ دراصل نوجوانوں ہی کا کام ہے اور بہتر ہوگا کہ اسے انہی کو کرنے دیا جائے۔ البتہ طویل عرصہ تک کسی تحریک کو قائم رکھنے کے لیے شاید کسی نہ کسی طرح کی تنظیم کی ضرورت ہوگی۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس ضرورت کی تکمیل الائنس اگینسٹ سی اے اے، این آر سی، این پی آر، ہم بھارت کے لوگ کولیشن اور ینگ انڈیا اگینسٹ سی اے اے، این آر سی، این پی آر جیسی عوامی تنظیمیں کرسکیں گی۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں بھی اس سلسلہ میں اپنے اپنے طور پر کام کررہی ہیں۔ انہی کوششوں کے نتیجہ میں ان سطور کے لکھنے کے وقت تک چار صوبائی اسیمبلیاں اس قانون کے خلاف ریزولیوشن پاس کرچکی ہیں اور حکومت کیرالہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں چارہ جوئی بھی کرچکی ہے۔

اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ صحیح معنوں میں ایک ہمہ گیر عوامی تحریک ہے جس کو عوام کے سبھی طبقات کی حمایت حاصل ہے۔ بعض واضح اسباب کی وجہ سے اس میں سماج کے دوسرے طبقات کے مقابلہ میں مسلمانوں کی نمائندگی زیادہ ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بلا امتیاز مذہب و ملت ایک عوامی تحریک ہے اور اس میں سماج کا ہر طبقہ شامل ہے اور یہی اس کی قوت کا راز ہے۔ اس کو دیکھ کر تحریک آزادی کے اس روشن دور کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جب ملک کے باشندے بلا کسی تفریق و امتیاز کے کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑ رہے تھے۔ بہت دنوں بعد یہ منظر پھر ملک میں نظر آیا ہے اور یہ اتحاد و اتفاق بہت حوصلہ افزا ہے۔ اس کے اندر ملک کے لیے ایک بہتر مستقبل کے لیے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں۔ یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ برادرانِ وطن کی ایک بڑی تعداد فرقہ پرست طاقتوں کی طویل اور مسلسل کوششوں کے باوجود ابھی تک فرقہ پرستی کے زہر

سے محفوظ ہے اور پرامن ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلہ میں جو مواقع سامنے آئے ہیں ان کے مضمرات اور امکانات کا صحیح طور پر ادراک کیا جائے اور ان کو مضبوط کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ باہمی مفاہمت، یگانگت، یکجہتی اور رواداری کے جذبات کو جو موجودہ حالات میں ابھر کر سامنے آ گئے ہیں، مضبوط کرنا نہ صرف وقت کی ضرورت ہے بلکہ ملک کے روشن اور پرامن مستقبل کے امکانات بھی اسی کے اندر پوشیدہ ہیں۔

ان مظاہروں اور دھرنوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں جان ڈالنے کے لیے اور شرکاء کا حوصلہ بڑھانے کے مقصد سے اردو کی انقلابی شاعری کا بھرپور استعمال کیا جا رہا ہے، فیضؔ، جالبؔ، بسملؔ اور اس طرح کے دوسرے انقلابی شعرا کے وہ اشعار جو انہوں نے اپنے وقت کے جابرانہ نظام کے خلاف لکھے تھے ان کو اس دوران اتنی کثرت سے پڑھا جا رہا ہے جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ان میں بھی سب سے زیادہ مقبول فیض احمد فیضؔ کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' ہے جو اس تحریک کی مخصوص نظم کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی ہے اور تقریباً ہر موقع پر بڑے جوش وخروش سے پڑھی جاتی ہے۔جالبؔ کی نظم ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو، میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا'' بھی خاصی مقبول ہے۔ رام پرساد بسمل کی ''سرفروشی کی تمنا پھر ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے'' جو تحریک آزادی میں بہت مقبول تھی، اس کی صدا بھی ان مظاہروں میں خوب گونجتی ہے۔مظاہرین کے حوصلہ کو بڑھانے کے لیے دوسرے شعرا کے حسب حال اشعار کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس موقع کی مناسبت سے بہت سے شعرا نے اشعار اور نظمیں لکھی ہیں۔اس میں اچھی شاعری، تک بندی اور مزاحیہ شاعری سب کچھ شامل ہے اور اس کی مقدار اچھی خاصی ہے۔ یہ شاعری ایک اچھے مطالعہ کا موضوع بن سکتی ہے۔ایک اور میدان جس میں طلبہ، طالبات اور نوجوانوں کی صلاحیتوں کا خوب خوب استعمال ہوا ہے وہ نئے نئے اور پرکشش نعروں کی ایجاد، طرح طرح کی جاذب نظر پلے کارڈس کی اختراع اور نہایت معنی خیز گریفٹی کی تخلیق ہے۔ان میں غیر معمولی تنوع، فنکاری اور قوت تخلیق کا اظہار پایا جاتا ہے۔اس کے بہت اچھے اور اعلیٰ درجہ کے نمونے تو بہت سی جگہوں پر مل جائیں گے لیکن جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ نے اس میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

مقالات

(۲)

حافظ مغلطائی کی کتاب
"الزھر الباسم فی سیر ابی القاسم"

☆ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

واقعات سیرت: مکی عہد نبوی

تاریخِ بعثت: امام سیرت ابن اسحاق کی حدیث زہری از حضرت عائشہؓ: "أن اول ما ابتدی به رسول اللهﷺ من النبوة الرؤیا الصادقة الخ"، جو منقطع ہے، کو بخاری سے متصل سے بنایا ہے اور پھر آپ کی بعثت کی مدت میں اختلاف پر روایات کثیرہ جمع کی ہیں۔ ان سب میں رسالت کو تنزیل قرآنی سے ارتباط دیا ہے۔ ابن اسحاق کی روایتِ یونس بن بکیر میں تنزیل کی ابتدا کی صراحت یوم الجمعہ رمضان سے کی ہے۔ خواب اور پھر بیداری میں آمد جبریلی کی روایات میں تطبیق دی ہے۔ دوسری قسم کی روایات میں بعثت ونبوت کی تاریخ دوشنبہ ۸/ربیع الاول عام الفیل ۴۱، ابن عبدالبر کے علاوہ مسعودی کی ۱۰/ربیع الاول ہے۔ ابن اسحاق کی ایک روایت کہ اللہ نے آپ کے اعزاز کا ارادہ کیا تو آپ رفع حاجت کے لیے دور جاتے تھے کی منقطع سند متصل بنائی ہے اور تحنث پر بھی بحث کی ہے۔ (الزہر الباسم: ۵۲۱-۵۲۲ وما بعد؛ حواشی محقق۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آغاز نبوت ربیع الاول اور ابتدائے تنزیل قرآنی رمضان کا فرق نہ کرنے سے یہ اختلاف روایات ہے۔ ان دونوں کی تاریخوں پر بھی بہت اختلاف منقول ہے۔ جبریل علیہ السلام کے مسح سینہ نبوی اور ملائکہ کی توکیل کی روایات بھی دی ہیں)۔

احبار کے ہاں صفت نبوی کے باب میں واقدی کی روایت پر سہیلی کے اکتفا کرنے پر نقد کر کے دلائل النبوۃ سے احادیث کا انبار عظیم لگایا ہے۔ محقق کی تخریج کے مطابق ان میں شامل کتب ہیں: ابونعیم، سیوطی، ابن عساکر، بیہقی، نبہانی/ حجۃ اللہ علی العالمین، دمشقی/سبل الہدیٰ، ابن عساکر طبرانی، ابن کثیر وغیرہ۔ ان کی تعداد ۴۲ ہے اور پھر ان کی اخبار مطول کا عام حوالہ دیا ہے۔ ان میں شامل ہیں: حدیث علی/

☆ پروفیسر، صدر، ڈائریکٹر (سابق) ادارہ علوم اسلامیہ وشاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

حدیث کعب الحبر، حدیث حکیم مع قیصر، حدیث عبدالمطلب مع الراہب وغیرہ (الزہر الباسم، ۵۳۸-۵۴۱، حواشی محقق: صفات النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عندالاحبار کی بحث ابن اسحاق/سہیلی پر اضافہ مغلطائی ہے مگر بلا نقد ہے۔ بعض روایات/احادیث کی تخریج میں محقق کامیاب نہیں ہوسکے اور اس کا اعتراف کیا ہے: لم اجدہ")۔

فترہ وحی اور تعلیم جبریلی وضو و نماز: کی بابت اول الذکر کی مختصر ہے اور موخر الذکر خاصی مفصل، ابن اسحاق کی مسند مقطوع کو مسند بنایا ہے اور نقد کیا ہے۔ (۱/۵۵۱-۵۵۴، حواشی محقق)

حضرت علی کی کفالت نبوی اور اسلام کی بحث میں حضرت موصوف کی عمر شریف کے بارے میں بہت سے مصادر سے روایات جمع کردی ہیں اور قول واقدی کہ وہ گیارہ سال کے تھے کو قول اثبت کے بطور پیش کیا ہے، (۱/ ۵۵۵-۵۶۴ مابعد، حواشی محقق۔ اصلاً وہ اولین مسلم کی بحث میں حضرت علی، زید بن حارثہ، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم وغیرہ پر طویل بحث ابن اسحاق وغیرہ کے تعلق سے ہے۔ اس میں روایات واحادیث ہیں اور ان پر سہیلی وغیرہ پر نقد ہے۔ واقدی کا قول اصح بیان کیا ہے کہ اولین مسلم حضرت خدیجہؓ ہیں اور بعد کے سابقین پر اختلاف ہے، روایات کے محاکمہ میں واقدی کے اثبات و ترجیح روایات/قول کا ذکر مغلطائی مسلسل کرتے ہیں جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا اور آگے بھی آتا ہے)۔

قول سہیلی کہ حضرت سعیدؓ بن زید عدوی نے صرف دو احادیث نبوی بیان کی ہیں پر سخت نقد کرکے بقی بن مخلد سے ان کی ۴۸/احادیث کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ مختلف صحاح اور کتب حدیث سے ان کی تخریج کی ہے۔ ان میں شامل ہیں: بخاری، ابوداؤد، ترمذی، عسکری، مسند ابو یعلیٰ، نسائی، مسند احمد، ضیاء مقدسی، دارقطنی، بزار، مسند احمد بن منیع وغیرہ۔ بھرپوری تلاش و تحقیق سے اس پر اضافہ کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے اور ابونعیم البرقی وغیرہ سے ان کی روایت کردہ احادیث کی تعداد نقل کی ہے۔

(الزہر الباسم: ۵۶۷-۵۷۰ ومابعد، حواشی محقق؛ اسی بنا پر حافظ مغلطائی کو امام حدیث بھی قرار دیا جاتا ہے)۔

قریشی اکابر کی مخالفت اور ابوطالب کی حمایت نبوی: کے وسیع موضوع پر مختلف روایات/اکابر کا ذکر مصادرِ حدیث و سیرت و تفاسیر سے کیا ہے جیسے: ۱۔ عمارہ بن ولید مخزومی اور ولید بن مغیرہ مخزومی کے معاملہ سے آیات مدثر کی شرح و تفسیر لغوی ومعنوی، کلام الولید از ابن اسحاق کو بلا سند بتانے کے بعد اسے سند حسن واحدی سے ثابت کرنا، آیت سورہ غافر: ۳، کی تفسیر مقاتل سے شرح۔ یہ شرح بحث آیات کے علاوہ کلام عرب سے بھی مدلل کی ہے۔ (الزہر الباسم: ۱/ ۵۷۷-۵۹۷، آخر میں الفاظ و

کلمات کی بحث بہت مفصل ہے،حواشی محقق،اعتراضات اکابر قریش وآیات پر بحث ا/۹۷۴-۹۸۰)۔

اسلام حمزہؓ پر ابن اسحاق کی سند منقطع کو ابن سعد کی روایت سے متصل بنایا ہے۔ یہ بحث بہت مختصر ہے۔(ا/۵۱۴،حواشی محقق)

ہجرت حبشہ: اول وثانیہ پر طویل بحث مدنی عہد کے ایک مبحث کے بعد آئی ہے اور کافی نئی روایات رکھتی ہے اور مصادر بھی بہت ہیں (ا/ ۶۴۵-۶۶۱؛ حواشی محقق)۔

اسلام عمر کے وقت مسلم تعداد بیان کردہ سہیلی پر نقد مغلطائی ہے اور متعدد مصادر سے ان کی اور تعداد نقل کی ہے۔ اسلام عمرؓ کی روایات پر خاصی بحث ہے۔(ا/۶۶۱-۶۷۲)

مکی دور کے اور بہت سے واقعات پر نیا مواد مغلطائی نے مختلف مصار سے جمع کیا ہے۔

مدنی عہد نبوی: امام سیرت ابن اسحاق/ ابن ہشام اور ان کے شارح سہیلی نے مدنی عہد نبوی کے آغاز میں یہودِ یثرب سے مباحث ومکالمات نبوی کا باب سب سے پہلے کھولا ہے۔ اس میں بیت المدراس میں یہود سے کلام نبوی بابتہ ابن اللہ اور قرآنی تنزیل: سورہ کہف: وغیرہ کا ذکر اشعار کے حوالہ سے ہے۔ اصلاً وہ سیرۃ ابن اسحاق میں سورہ کہف اور دوسری سورتوں کی آیات کا ایک عظیم وجامع مبحث ہے اور مغلطائی نے بہت سی تفاسیر سے اس میں شروح آیات وغیرہ کا انبار عظیم لگایا ہے۔ قرآنی و تفسیری مباحث میں امام سیرت اور حافظ مغلطائی کا یہ ایک نادر تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں اولین شہداء اسلام عہد مکی کا بھی ذکر خیر بعد میں آیا ہے اور القاب ملوک الاقالیم پر ایک طویل بحث ہے۔ پھر ہجرت حبشہ پر ایک طویل بحث افراد وغیرہ کے حوالے سے ہے (الزہر الباسم: ا/۶۱۴-۶۴۴،حواشی محقق، واقعات وحوادث عہد کے زمانی وتوقیتی تقدیم وتاخیر کے مسئلہ نے یہ افراتفری پیدا کی ہے)۔

قبائل عرب سے طلب نصرت/عرض کی بحث میں خزرج کے افراد سے ملاقات، بیعت عقبہ وغیرہ کا ذکر خاصا مفصل ہے۔ اس کے مباحث ہیں:

ا۔ سفر طائف زید بن حارثہؓ کے ساتھ اواخر شوال ۱۰ ر نبوی، دس روزہ قیام، ابن سعد۔ ۲۔ سیرت ابن حبان: امر الٰہی پر عرض قبائل عرب۔ ابن اسحاق کی بلا سند روایت کو ابوداؤد سے مسند بنایا، موقف میں ملاقات کرتے تھے۔ ۳۔ سوید بن صامت کا نسب ورشتہ مادری۔ ۴۔ مختلف صحابہ کے اسماء کی تعیین۔ ۵۔ بعاث جنگ کی متعدد مصادر سے روایات (الزہر الباسم: ۲/۲۷۴-۲۸۲، حواشی محقق)۔ ۶۔ بیعت عقبہ اور شرکاء: اسعدؓ بن زرارہ اور ذکوانؓ بن عبدالقیس کی عتبہ بن ربیعہ سے

منافرہ کے لیے آمد اور ملاقات نبوی اور اسلام، دونوں اسعد اور ابوالہیثمؓ یثرب میں توحید کے علمبردار تھے۔ ۷۔ بنوالنجار کے آٹھ نفر کا اسلام۔ ۸۔ خزرج اور قبائل یثرب کی تحقیق نئی قیمتی معلومات ہیں۔

آغاز ہجرت مدینہ/ سابقین مہاجرین: ۱۔ مفاتیح الکعبہ کی خبر سہیلی پر نقد و استدراک ۲۔ بنوجحش کے ترک وطن کے ضمن میں ان کے بعض نسائی افراد پر نقد مغلطائی ۳۔ ایسی اور بھی تنقیدات سہیلی ہیں ۳۔ ابوکبشہ کی روایات ۴۔ طویٰ نامی مقام کی تحقیق ۵۔ مولیٰ نبوی حضرت انسہؓ کی بدر میں شہادت کا ذکرِ تقدیم اور نقد سہیلی، حضرات صہیبؓ وغیرہ کی ہجرت۔ (۱/۷۸۳-۷۹۵)

ہجرت نبوی: ابن اسحاق کی روایت بابتہ ابوجہل کے ارادہ شب خون پر بحث و استدراک، دوسروں کی شمولیت، کم از کم سو تھے۔ ۴۔ ہجرت نبوی و ابوبکرؓ کی رات میں روایت ابن اسحاق سے بخاری کی حدیث عائشہؓ سے تردید، ہجرت نبوی کے مختلف مراحل کی نئی روایات اور ان کی اسانید پر بحث اور اشعار وغیرہ سے استدلال، ہجرت نبوی پر شعراءِ عرب کے اشعار کا اضافہ مستدرک حاکم وغیرہ سے، یثرب کی طرف ہجرت کا امر الٰہی، حدیث نبوی کی شرح و تفسیر، غار ثور میں ملاقاتِ ضروری کی ہدایت نبوی، حضرت علیؓ کو بحوالہ اکلیل، حضرت ابوبکرؓ کی رفاقت اور ان کی مسرت پر فرحت کی حدیث وغیرہ، حدیث ہجرت ابن اسحاق کی سند بخاری سے، اشخاص: جیسے ام معبدؓ، معبد و ابومعبد وغیرہ کی تفصیل اور متعدد مقامات و منازل ہجرت کی جغرافیائی تحقیق، تعاقب سراقہؓ کی بحث پر نقد سہیلی، مدینہ آمد/ قبا میں دونوں کی متعدد تاریخیں بہت سے مصادر سے: فتح الباری، ابن الکلبی، جریر بن حازم/ ابن اسحاق، اکلیل خوارزمی، ابن حبان، ابن حزم وغیرہ، قبا میں قیام نبوی کی مختلف تاریخوں کا بھی ان میں ذکر ہے۔ مسجد قباء کی تعمیر میں حدیث الشموس پر نقد و استدراک سہیلی، سنہ ہجری کی عہد فاروقی میں تعیین، مسجد نبوی مدینہ کی آراضی کے مالکان سہلؓ و سہیلؓ سے محاکمہ، منزل ابی ایوبؓ کے زیریں حصہ میں قیام نبوی کا واقعہ اور گھڑے کے ٹوٹنے کا حادثہ اور اس پر بحث و نقد، امام سیرت ابن اسحاق کے بیان کہ ہجرت نبوی کے بعد آپؐ سے مہاجرین آملے پر نقد سہیلی کہ آپ کے بعد مکہ میں صرف محبوس لوگ رہ گئے تھے، جب کہ مغلطائی کا یہ بیان غلط ہے۔ متعدد ہی نہیں بہت سے ایسے تھے جو وہاں مقیم رہے تھے۔ متعدد صحابہ کرام کے اسماء گرامی جیسے ابوالدرداءؓ و ام الدرداءؓ کے بارے میں سہیلی پر نقد مغلطائی، اذان و اقامت پر بحث سہیلی پر مزید نقد کہ شب اسراء میں اذان سنی تھی، ابوقیس صرمہ ابی انسؓ کے نام کی تصحیح قیس بن صرمہ سے۔ اس بحث و فصل میں بعض دوسرے اور متاخر واقعات و معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں جیسے:

ا۔ لمبے ہاتھوں والی زوجہ محترمہ کی حدیث کا مطلب اور مراد۔ ۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کی نوعیت وحقیقت۔ ۳۔ آیت کریمہ: مائدہ:۶۷ ''وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاس'' وغیرہ کی تفسیر مختلف تفاسیر سے۔ ۴۔ حضرات عبداللہ ابن سلام ومخیریق کے خیرا لنصاریٰ اور اسلام پر بحث ونقد سہیلی اور متعدد اکابر یہود کا اسلام یا عنادی رویہ۔ اس میں متعدد آیات کریمہ اور اشعار کا بھی ذکر ہے۔ یہ بہت طویل بحث ہے اور یہود یثرب کے تعلقات نبوی کی آئینہ دار اور سیرت نگاری کی نئی جہات دینے والی۔ ۵۔ تحویل قبلہ کی بحث بھی اس کے بعد ہے اور اس سے قبل بھی آئی ہے۔ اس میں متعدد مصادر سے اختلافی روایات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ نسخ قبلہ پر فقہی وکلامی بحث ہے اور یہود کے رد عمل پر مباحثہ بھی ہے۔ (الزہرالباسم: ۷۹۶-۸۷۹، حواشی محقق)

غزوات نبویؐ: نبوی مغازی، غزوات وسرایا۔ کا جامع عنوان نہ حافظ مغلطائی کے مخطوطہ میں ہے اور نہ ہی محقق عزیز نے قائم کیا ہے۔ غزوہ ودان سے ان کا آغاز ہوتا ہے اور وہ مخطوطہ کے حاشیہ میں ''اثبات شدہ'' ہے جیسا کہ بیان محقق ہے۔ خود محقق نے متعدد غزوات کے عناوین قائم کیے ہیں۔ ان میں سے بیشتر صحیح ہیں اور بعض بعض میں خلط ملط ہو گیا ہے کہ عنوان کسی غزوہ کا ہے اور بحث کسی اور پر ہے۔ اہم غزوات کے عناوین حافظ مغلطائی کے قائم کردہ ہیں۔ ان تمام غزوات وسرایا میں حافظ مغلطائی کے مشترکہ واجماعی بیانات وتصریحات میں شامل ہیں: سہیلی کے بیان/ روایت پر نقد واستدراکِ مغلطائی کے مقامات جیسے ودان، ابوا، بدر، عشیرہ وغیرہ کی جغرافیائی تعیین، ان کے بیان وشرح سہیلی پر نقد اور اشعار عرب وغیرہ سے۔ استدراک مغلطائی کا ایک غیر معمولی اور مستقل مبحث قریب قریب ہر بیان سیرت میں بالعموم اور غزوات وسرایا میں بالخصوص یہ ملتا ہے کہ وہ روایات واحادیث واشعار وغیرہ کی لغوی تحقیق بہت کرتے ہیں۔ اہم ترین سیرتی وواقعاتی مباحث وروایاتِ مغلطائی ہیں، مختلف مصادر سے تاریخ غزوہ اور تعداد شرکاء اور مقامات غزوہ وسریہ وغیرہ جیسے غزوہ ودان میں تاریخ ومقامات کا مبحث تو مختصر ہے اور اشعار میں واردلفظیات ومسائل کا مبحث بہت مفصل ہے، (۲/۸۸۰-۸۸۷، حواشی محقق) غزوہ بواط (۸۸۸-۸۸۹)، غزوۃ العشیرہ (عنوان محقق/ بنوضمرہ کی نسبی تحقیق، غزوات کی تعداد پر احادیث صحابہ کرام اور ان کا اختلاف)، سریہ سعد بن ابی وقاص (۲/۸۹۲-۸۹۳، حواشی محقق)، غزوہ سفوان (عنوان محقق مگر بحث بابت سریہ سعد مذکورہ بالا، اولین امیر المومنین حضرت عبداللہ جحش اور اس کے اولیات فاروقی میں سے ہونے پر نقد مغلطائی، یہ نقد جزوی طور پر صحیح ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ نبوی کی جگہ

امیر المومنین اختیار کیا تھا اور وہ ان کی اولیات سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن جحش کا امیر المومنین خطاب/لقب صرف بطور امیر سریہ تھا، وہ لغوی معانی و جہات رکھتا ہے۔ (۲/۸۹۴-۸۹۶، حواشی محقق)

غزوۃ الکبریٰ (قائم کردہ محقق): غزوہ بدر کا مبحثِ مغلطائی بہت مفصل ہے اور بہت سے مباحث و معاملات غزوہ کا ایک عظیم تحقیقی مطالعہ ہے۔ اس کی چند اہم ترین جہات یہ ہیں:

۱۔ تسمیہ بدر اور اس کی اقتصادی اہمیت پر روایات، مدینہ سے مسافت وغیرہ، شرف المصطفیٰ، امام زہری، ضحاک، الکبریٰ، شعبی، واقدی وغیرہ سے۔

۲۔ بسبس بن عمرو کی جہینہ کی طرف نسبت اور قبیلہ جہینہ پر بحث، مسلم بدری صحابہ میں سے متعدد کی شرکت یا عدم ذکر پر نقد سہیلی۔

۳۔ قریشی اکابر کی شرکت، اہم شرکاء و اکابر، ان کے رویہ، تخلف ابولہب ہاشمی، مقامات برک الغماد کی شرح، رویاء عاتکہ۔

۴۔ صحابہ کرام کی مشاورت میں خاص حضرت سعد بن معاذ کا ذکر اور سعد بن عبادہ کے عدم شرکت کی بحث۔

۵۔ حضرات علیؓ، زبیرؓ وسعدؓ وغیرہ کا طلیعہ برائے تفتیش ارادہ قریش، نبوی رمی جمار (کنکریاں) واقعہ حضرت عمیر بن حمام کی حدیث ابن اسحاق کا استناد، عریش کی تعمیر و قیام نبوی، ابوالبختری وغیرہ "خیار اکابر" اور بالجبر شرکت کرنے والوں کے قتل سے ممانعت نبوی، عمائم بدر/ ملائکہ وصحابہ، مبارزین مدینہ کو لشکر کفار کے قریب آنے پر تیر اندازی شروع کرنے کی ہدایت نبوی، ملائکہ جبریل وغیرہ کی امداد، متعدد مسلم نوجوانان کی لشکر کفار کی طرف سے شرکت اور ان کا قتل، شرکاء بدر کے اسماء وغیرہ، متعدد صحابہ کی شرکت پر نقد سہیلی وغیرہ۔

۶۔ انساب و اسماء شرکاء سے متعلق خاص مفصل مباحث۔

۷۔ انفال بدر کی بحث اور اس کے ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیل/فرس، اونٹ، گھوڑے، تلواریں، نیزے و اسلحے کی مکمل بحث جو بہت مفصل ہے۔ یہ عام متروکات و ملکیات نبوی کا باب ہے۔

ان سب میں اضافات مغلطائی خوب ہیں۔ آخر میں مقتولین بدر/کفار اور ان کے صاحبان قتل کا ذکر ہے اور شہداء کرام کا بھی۔ الفاظ و اصطلاحات کا مبحث ختم پر ہے۔ (الزہر الباسم: ۸۹۷-۱۰۲۷، حواشی محقق)

دوسرے غزوات نبوی کے باب میں مباحث مغلطائی کا یہی انداز ہے اوران سب پر بحث مباحثہ طول کلام کا باعث ہوگا، لہٰذا چند خاص اور اہم ترین جہات مغلطائی کا حوالہ/ اشارہ بعض بڑے غزوات وسرایا کے ضمن میں پیش کرنا مناسب لگتا ہے:

بدر واحد کے درمیان غزوات وسرایا میں ان کی تاریخوں، روایات و اشعار کے مختصر مختصر مباحث وغیرہ ہیں اور عام قسم کے ہیں۔ (الزہر الباسم: ۱۰۲۸-۱۰۴۴، حواشی محقق)

غزوہ احد: تاریخ، واقعات وغیرہ مختلف مصادر سے نقل کر کے سہیلی/ ابن اسحاق وغیرہ کی بعض روایات پر نقد واستدراک مغلطائی ہے۔ متعدد مقامات کی شرح ہے۔ غیر مسند/ منقطع روایات واحادیث کا استناد کیا ہے۔ اس غزوہ میں خاص بحث مغلطائی شہداء احد پر نماز جنازہ اور اس کے دلائل مغلطائی ہیں اور شہداء دیگر غزوات پر نماز جنازہ سے استشہاد کی بحث بہت تحقیقی ہے۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت و ماتم پر بھی عمدہ مباحث ہیں۔ واقدی کی طرح مغلطائی نے غزوہ احد سے متعلق آیات قرآنی کا ایک جامع ونادر ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور بعض نئی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اشعار وکلمات کی شرح بھی اہم ہے۔ (الزہر الباسم، ۱۰۴۵-۱۱۱۳، بالخصوص ۱۰۶۷-۱۰۷۱، حواشی محقق)

سریہ رجیع کا ذکر محقق نے ''ذکر یوم الرجیع'' کے اپنے عنوان سے کیا ہے۔ عام مباحث کے علاوہ حضرت خبیبؓ کی اسیری وشہادت پر بعض قیمتی معلومات جمع کی ہیں جیسے ان کی خرید قاتل حجیز کی قیمت اسّی طلائی مثقال/ سو اونٹ بتائی ہے اور اسی طرح حضرت زیدؓ بن الدثنہ کی قیمت خرید صفوان نے پچاس اونٹ/ اونٹنی (فریضۃ) کی شکل میں ادا کی تھی بحوالہ واقدی۔ حضرت عاصمؓ کے بارے میں ایسی ہی بعض روایات کے علاوہ زیادہ ارتکاز اشعار وشروحِ لفظیات پر ہے۔ (الزہر الباسم: ۱۱۱۴-۱۱۳۲، حواشی محقق)

غزوہ بنی النضیر: توقیت ابن اسحاق کی تائید اور سہیلی پر نقد کیا ہے اور بعض دیگر بیانات سہیلی پر نقد مغلطائی بہت عمدہ اور صحیح ہے، واقعات ابن اسحاق سے لیے ہیں اور تائید صحیحین سے کی ہے، اس میں اشعار ومقامات ورواۃ اور متعدد امور کے بارے میں بہت معلومات ہیں۔ الوان/ اقسام نخل پر عمدہ شرح ہے اور متعدد تفاسیر سے استدلال واستشہاد ان کا خاص عطیہ ہے۔ مختلف مصادر سے بعض جزئیات کو جمع کر دیا ہے جیسے طلب دیت میں دس صحابہ کرام کی رفاقت رہی تھی۔ (الزہر الباسم: ۱۱۳۳-۱۱۵۰، حواشی محقق)

غزوۃ ذات الرقاع: روایت ابن اسحاق سے آغاز کر کے واقعات وحوادث غزوہ واقدی، ابن سعد، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر، بیہقی/ دلائل وغیرہ سے نقل کیے ہیں۔ رقاع کا تسمیہ ہے اور غزوہ کا

''غزوۃ الاعاجیب'' کا نیا نام ہے۔توقیت پر اختلاف مصادر، مقام صرار پر جزور یا بقرۃ کی قربانی کا فرق ابن اسحاق و مسلم سے بتایا ہے اور واقعہ دعثور مصادر سے نقل کیا ہے۔اس میں زیادہ بحث صلاۃ الخوف سے ہے اور اس کی پوری تاریخ ہے نقد سہیلی وغیرہ کے ساتھ اور بہت سے مصادر سے۔ دوسری بحث جمل جابرؓ کی خریداری نبوی پر ہے اور اس کی روایات کے الفاظِ صحیح کی عمدہ تخریج و تجزیہ ہے۔بعض دوسری نئی معلومات و تنقیدات ہیں جیسے مدینہ پر نائب/خلیفہ نبوی کی حیثیت سے حضرت حنظلہؓ الغسیل کا تقرر ہوا تھا۔(۲/۱۱۵۱۔۱۱۶۰،حواشی محقق)

غزوہ بدرالآخرہ کے مختصر باب میں توقیت کے اختلافات مصادر کے علاوہ دوسری بحث حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی کی بطور خلیفہ نبوی کی روایتِ امام کے خلاف ابن سعد و حاکم کی روایت عبداللہؓ بن رواحہ کے بارے میں ہے۔واقدی کے بیان کردہ ایک شعرِ حضرت حسانؓ کے عدم ذکر ابن اسحاق پر نقد ہے کہ متداول کو نظرانداز کر دیا۔(۲/۱۱۶۱۔۱۱۶۳؛حواشی محقق)

غزوۃ دومۃ الجندل کی توقیت، مقام و شرکاء وغیرہ کی روایاتِ مصادر کے علاوہ ایک نادر بحث و شمار عرب ''جرادون'' (سواروں) کا ہے جو بغدادی کی کتاب المحبر کے حوالے سے ہے اور اس میں عام عرب کے ''جرادون'' کے ساتھ ربیعہ اور قضاعہ اور یمن اور حمیر کے جرادون کے بیسیوں نام گنائے ہیں (۲/۱۱۶۴۔۱۱۶۵،حواشی محقق میں حاشیہ:۴، جرادون پر سہیلی کے باب غزوۃ الخندق عیینہ بن حصن کا حوالہ ہے جس میں جرادون کا ذکر نہیں ہے۔البتہ ان کی خدمت نبوی میں بلا اذن داخلہ کا حوالہ ہے۔)

غزوہ الخندق کے عام مباحث جیسے تاریخ، ابن عمرؓ کی شرکت/خندق کی کھدائی اور اسی کے واقعات وغیرہ مختلف مصادر حدیث و سیرت سے نقل کیے ہیں۔ان کے علاوہ خاص مباحث مغلطائی ہیں:ا۔مختلف تاویلات و تشریحات سہیلی پر نقد، بعض احادیث ابن اسحاق کے ضعف کا نقد اور دوسرے مصادر سے اس کی تصحیح (۲/۱۱۶۶۔۱۱۷۱،حواشی محقق)اسی میں غزوہ بنی قریظہ کا عنوان آ گیا ہے اور اس کے مباحثِ مغلطائی ہیں۔الفاظ و کلمات روایات کی لغوی تشریح، حضرت دحیہؓ کی شکل میں حضرت جبریلؑ کی شرکت، اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کے فضائل کی حدیث: ''ان فاطمۃ مضغۃ منی'' پر بحث و سند پر نقد، حضرت ابولبابہؓ کا ذکر، قریظہ میں پہونچ کر نماز عصر پڑھنے کی ہدایت نبوی کی شرح و تاویل، حضرت سعدؓ بن معاذ کی تحکیم وغیرہ اور اشعار کثیر، بعض یہودان بنی قریظہ کی معافی اور بہت سے اشعار کا انبار عظیم، شہادت حضرت سعدؓ پر عرش الٰہی کا اہتزاز، سیدی/السید ہو اللہ، ہزیمت و نقد، مختلف

لوگوں کے تسمیہ اور بہت سے الفاظ وکلمات کی شرح پر ارتکاز خاص ہے۔(۲/۱۱۷۲-۱۲۰۳، حواشی محقق، اس کے بعد متعدد غزوات وسرایا کے ابواب ہیں جن میں کچھ خاص مباحث نہیں ہیں۔)

غزوہ بنی المصطلق: جزوی مسائل پر نقد و بحث مغلطائی ہے، جیسے قبیلہ کا نام ونسب، مدینہ پر عامل نبوی کا تقرر، توقیت غزوہ، ہشام بن صبابہ اور جہجاہؓ کا معاملہ، عبداللہ بن ابی کے قتل سے انکار نبوی پر ان کے فرزند کے اشعار، حضرت جویریہؓ کی آزادی وزواج پر روایاتِ مصادر، اغلاط الرواۃ کی بحث، اشعار کثیرہ، حضرت جویریہؓ کے نام کی تبدیلی کے حوالے سے حضرت میمونہؓ کے نام کی تبدیلی وغیرہ کی سنت نبوی، حضرت صفوانؓ بن معطل کا ناقص ذکر اور دوسرے اکابر جیسے حضرت ماریہؓ/سرینؓ کا ذکر بطور مثال، واقعہ افک میں حضرت ابوایوبؓ وام ایوبؓ کے مکالمات، سورۃ النور کی آیات کے حوالے وغیرہ، اس میں حضرت علیؓ سے مکالمات نبوی اور رویہ حضرت موصوف کا ذکر بالکل نیا ہے۔(۲/۱۲۰۴-۱۲۰۳۸، حواشی محقق، حدیثِ افک ابن اسحاق و بخاری وغیرہ سے بحث نہیں کی اور صرف جزئیات سے سروکار رکھا ہے۔)

امر الحدیبیہ وبیعۃ الرضوان کے عام تاریخی مباحث ہیں: ۱۔مدینہ پر خلیفہ نبوی پر اختلاف مصادر بلامحاکمہ، تعداد شرکاء پر اختلاف مصادر بلانقد، منازل نبوی پر مختلف روایات، دلیل راہ، صاحب بدنہ کی تعیین اور اختلاف، اشعار بدن/مویشی پر فقہی بحث، بدیلؓ بن ورقاء کی سفارت نبوی، حلیس کے قول پر نقد مغلطائی، عروہؓ بن مسعود ثقفی کے کلام وسفارت پر نقد وغیرہ، بیعۃ الرضوان کے عنوان سے حضرت عثمانؓ کے لیے بیعت نبوی کی حدیث کی شرح، نزول سورہ فتح کی تحقیق اور ابن اسحاق پر مقام نزول کے عدم ذکر کی وجہ سے نقد، اس کے بعد کتاب/کاتبین نبوی پر ایک مختصر بحث مغلطائی ہے۔حلاق نبوی کے علاوہ ابن اسحاق پر معاہدہ صلح کے شاہدین کا اضافہ، کتابت کے فن سے نبوی واقفیت پر بحث نئی ہے اور اسی میں آداب فن کتابت بھی ہیں۔مسلم مہاجرات ومبایعات کا سورۂ ممتحنہ کے حوالہ سے ذکر، حضرت ابوبصیرؓ کا واقعہ اور اشعار۔(۲/۱۲۳۹-۱۲۵۸؛ حواشی محقق)

غزوہ خیبر کے عام تاریخی مباحث ہیں: تاریخ وتوقیت کی روایات کے اختلاف مصادر کے حوالہ سے۔ ۲۔مدینہ پر خلیفہ نبوی کا تقرر/نمیلہ لیثیؓ پر بحث، حضرت عامر بن عمرو بن الاکوع کی رجز/حدی خوانی کی حدیث وروایت اور ان پر نقد واستدراک مغلطائی، ۳۔کسی غزوہ میں صبح/اذان تک حملہ نہ کرنے کی سنت نبوی، مختلف رواۃ وافراد کی سوانح وغیرہ، حمر الاہلیہ کی حلت وحرمت پر احادیث اور بحث جو خاصی مفصل اور بحوالہ آیات واحادیث ہے۔مرحب کے قتل بدست محمدؓ بن مسلمہ پر روایت ابن اسحاق

کی دوسری مصادر سے توثیق اور اس طرح حضرت علیؓ کی قتل مرحب کی روایات پر بحث اور ان کی ترجیح، مغانم کے افسر حضرت ابوالیسرؓ کی تقرری، فتح قلعہ قموص کی روایات پر بحث، حضرت صفیہؓ کی گرفتاری، رؤیا/منام بلااسناد وغیرہ پر بحث، زہرآلود بکری کا گوشت کھلانے والی یہودیہ کے واقعہ پر بحث اور اس کے اسلام کا ذکر وغیرہ مع نقد، ہدایائے نبوی، شہدائے خیبر، قاسم خیبر کی روایات، حضرت جعفر طیارؓ کی واپسی/آمد پر فرحت نبوی کی روایات کا تجزیہ اور بہت سے اقوال واشعار اور اسماء کی شرح وغیرہ۔(۲/۱۲۵۹-۱۲۹۲، حواشی محقق)

خیبر اور عمرۃ القضاء کے درمیان تمام سرایا پر ابن اسحاق کے حوالے سے بحث مغلطائی ہے۔(۲/۱۲۹۳-..........، حواشی محقق)

عمرۃ القضاء کا ذکر مختصر ہے اور خلیفہ نبوی کے مدینہ کا تقرر، رجز خوانی عبداللہؓ بن رواحہ اور بحالت احرام یا بحالت حلال حضرت میمونہؓ سے شادی وغیرہ تک محدود ہے۔(۲/۱۲۹۴-۱۲۹۷، حواشی محقق)

غزوہ موتہ کا مبحث بھی مختصر ہے اور جزوی معاملات تک محدود مباحث خاص ہیں:

۱۔موتہ کا تسمیہ واملا۔ ۲۔افواج ہرقل/روم سے مشارف نامی مقام پر غزوہ/جنگ اور بحث تفسیرِ مقام سے۔ ۳۔واقدی کے حوالہ سے سبب غزوہ، واقعات غزوہ۔ ۴۔حضرت جعفر کا گھوڑے کے کونچ کاٹنے کے واقعہ اور حدیث پر بحث، آل جعفر کے لیے کھانا پکانے/بنانے کی حدیث، حضرت خالدؓ کی اخذ رایت/کمان پر بحث ونقد سہیلی، متعدد الفاظ وکلمات کی شرح اور شہداء موتہ کا مختصر ذکر۔(۲/۱۲۹۸-۱۳۰۷، حواشی محقق)

فتح مکہ کے اہم ترین مبحث میں آغاز حدیث بخاری سے کیا ہے اور توقیت وتاریخ خروج نبوی بتائی ہے۔ پھر دوسرے واقعات کا جزوی ذکر ومبحث ہے جیسے حضرت ابوسفیانؓ کی تجویز وکلام معاہدہ حدیبیہ کی برقراری پر سکوت نبوی کی روایت سہیلی پر نقد، اکلیل کے حوالہ سے کہ آپ نے معاہدہ عہد کی پاسداری کا ذکر فرمایا، بعض منازل سفر کا حوالہ، حضرت حاطبؓ کے خط کا واقعہ اور ان کی سوانح کے باب میں قول سہیلی پر نقد کہ وہ مولیٰ زبیرؓ بن العوام تھے۔ان کی لخمی نسبت پر عسکری کے حوالہ سے نقد، خط بردار سارہ کی تحقیق، اقدام نبوی، شرکاء/مجاہدین کی تعداد پر اختلاف روایات، رایت/رایات نبوی پر مختصر بحث، ابوسفیانؓ بن حارث کے فرزند ابوالہیاج پر بحث، خدمت نبوی میں ابوسفیانؓ و

عباسؓ وحکیمؓ وغیرہ کی حاضری اور اسلام، یوم الملحمہ/ یوم المرحمہ کا معاملہ، حضرت ابوقحافہؓ کا اپنی دختر سے مکالمہ، چار دختر ات ابوقحافہ کا ذکر بحوالہ بلاذری جو نیا ہے، مکہ میں داخلہ نبوی اور لشکر کے طریق/ سمتیں اور اس کے معنی وحکمت میں دعائے براہیمی کا دخل، ابن خطل، ام ہانیؓ، جمانہؓ وغیرہ شخصیات کا ذکر، ابومحذورہؓ کے نام پر بحث، باب کعبہ پر خطبہ نبوی/ حدیث کی تخریج متعدد مصادر سے، تطہیر کعبہ، انصار کا خدشہ اقامت مکہ، بنوسلیم کے لشکریوں کی تعداد، حضرت خالدؓ کے کام سے نبوی کی براءت حدیث، شہداء مسلم کی تعداد وغیرہ۔(۲/ ۱۳۰۸-۱۳۴۲، حواشی محقق)

غزوہ حنین کے بیان میں نادر و نایاب کلمات نبوی میں پانچ کلمات کے ذکر سہیلی پر اضافات مغلطائی کا مبحث جوامع الکلم کا ایک نایاب ذخیرہ رکھتا ہے جو ابن درید کے المجتبیٰ وغیرہ سے جمع کیا ہے اور محقق نے ان کی تخریج وتعیین کی ہے۔(۲/۱۳۴۳-۱۳۴۶) پھر بعض تشریحات سہیلی اور بیانات ابن سحاق پر تبصرے ہیں جن کا تعلق افراد وصحابہ سے ہے جیسے ابن الصمد، ابی حدردؓ/ نام عبداللہ بن سلامہ وغیرہ اور ان کی سوانح، بعض قبائل وبطون عرب کا ذکر ہے۔ واقعات غزوہ کا ذکر بہت کم ہے۔ اس میں سیرت ابن اسحاق کے ''بعض النسخ'' کا حوالہ دلچسپ ہے،(۲/۱۳۵۲)، واقعات میں ثابت قدم صحابہ کا ذکر متعدد مصادر سے ہے، اکابر قریش میں کئی کا حال بیان کیا ہے۔ ابوطلحہؓ کے ''سلب عشرین رجلا'' اور ام سلیمؓ کے خنجر کا ذکر ہے، غزوہ اوطاس میں ابوعامرؓ کی شہادت کا حوالہ ہے۔ ہزیمت سے قبل لوگوں کے باہمی قتل کا حوالہ ہے۔ زیادہ تر مباحث اسی نوعیت کے ہیں، سہیلی کے بیان کردہ بعض مقامات کی شرح وتنقید بھی ہے۔(۲/۱۳۴۳-۱۳۵۸، حواشی محقق)

غزوہ الطائف کے نام ونسب/ الدمون بن صدف پر سہیلی کا نقد ہے۔ یہ تاریخ طائف کا معاملہ ہے۔ ابوحنیفہ دینوری پر نقد ہے، جاہلی حروب کا حوالہ ہے۔ اسی طرح کے متعدد مباحث قدیم تاریخ وجغرافیہ سے متعلق ہیں اور اشعار سے استدلال ہے۔ ایک مخنث کے بادیہ بنت غیلان کے سراپا کے بارے میں قول: تقبل باربع و تدبر بثمان'' پر بحث ہے۔ امیر انفال کا حوالہ ہے کہ ابوجہمؓ بن حذیفہ اس کے امیر تھے اور ان سے خالد بن البرصاء کے تنازعہ کا ذکر معہ نقد، طائف کے واقعات میں محاصرہ کی مدت پر اختلاف، منجنیق کے استعمال نبوی وغیرہ کا مختصر حوالہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اموال غنیمت کی طلب میں بعض بدوی لوگوں کی بدتمیزی اور چادر مبارک کھینچنے کے واقعہ پر بحث ونقد ہے۔ عدل نبوی کا واقعہ بعد میں آتا ہے۔ عوفؓ بن مالک کے وفد ثقیف میں بطور مسلم حاضر ہونے کا

حوالہ ہے۔ابومحجن ثقفیؓ وغیرہ بعض اکابر کا ذکر مختصر ہے۔(۲/۱۳۵۸-۱۳۷۸،حواشی محقق)

غزوہ تبوک: بنوالاصفر کی وجہ تسمیہ،حضرت ابوذرؓ کے اصل نام جندبؓ بن جنادہ وغیرہ پر بحث،ابن اسحاق کی روایت کہ آپ نے عذر خواہوں کی عذر خواہی نہیں مانی پر بحث،حضرت علیؓ سے فرمان نبوی بمنزلہ ہارونؑ کی شرح،تبوک میں بیس روزہ قیام،غزوہ تبوک سے تخلف کرنے والوں کی تعداد چھ کا ذکر خاص بروایت سلیمان تیمی،مسجد ضرار،مختلف صحابہ کے بارے میں آیات سورہ توبہ-۱۰۲ وغیرہ کی شرح،بئر ثمود اور استسقا اور واقعہ ذوالبجادینؓ وغیرہ کا ذکر کرکے خاتمہ''میں تین پیچھے رہ جانے والے صحابہ'' کے بارے میں حدیث منقطعہ کو شیخین سے موصول بنایا ہے۔

امر وفد ثقیف: قصہ عروہ بن مسعودؓ،مدینہ کی نو مساجد پر نقد سہیلی/امام سیرت کہ ان کی تعداد پچاس پچپن سے زیادہ تھی،حدیث عثمانؓ بن ابی العاص کی شرح،عبداللہ بن ابی سلول کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا ذکر بحوالہ آیات کریمہ،اس کے چند مباحث اور ہیں۔(۲/۱۳۷۹-۱۳۸۵،حواشی محقق)

وفود قبائل پر بحث/اضافاتِ مغلطائی: وفد عبدالقیس کے سہیلی کے ترک کردہ افراد/ارکان کا اضافہ ہے،قدوم وفد بنی تمیم،قصہ عامرؓ بن الطفیل واربد،قدوم ضمامؓ بن ثعلبہ،حضرت لبیدؓ سے ترک شعر کا استفسار حضرت عمرؓ،قدوم الجارود وغیرہ معہ اشعار،قدوم وفد ہمدان،اسلام بنی الحارث وغیرہ کی مختصر تشریحات مغلطائی ہیں۔(۲/۱۳۸۶-۱۴۰۶،حواشی محقق۔ذکر الکذابین سے قبل الاشارۃ الی سیرۃ المصطفیٰ کا حوالہ کہ غزوات وبعوث سو سے زیادہ تھیں:۲/۱۴۰۵۔)

حجۃ الوداع: دو شیوخ ابن اسحاق:یحییٰ بن عبداللہ اور یزید بن طلحہ کا ذکر بحوالہ ابن حبان کی کتاب الثقات اور حضرت علیؓ کی شکایت کی حدیث کی تخریج کل بحث ہے۔(۲/۱۴۰۷)

رسائل النبی الی الملوک میں صرف ایک شخص کا نام ونسب بیان کیا ہے۔غزوۃ ذات السلاسل کا ذکر سہیلی کی ایک ''حدیث ذئب'' کے گرد گھومتا ہے اور پھر جبلہ بن الایہم کا مختصر ذکر کرکے ابن اسحاق کے بیان کردہ عدد غزوات چھبیس اور واقدی کی تعداد ستائیس پر نقد سہیلی کا استدراک کیا ہے کہ سیرت ابن اسحاق میں بھی واقدی کی طرح ستائیس کا ذکر ہے۔اس کے بعد چند معمولی معاملات کا ذکر ہے جیسے(۱)ام قرفہ کی اولاد کی تعداد اور سریہ زیدؓ بن حارثہ/ام قرفہ پر نقد،سہیلی کی صحیح مسلم میں اس کا امیر حضرت ابوبکرؓ کو بتایا ہے،غزوہ عبداللہؓ بن رواحہ اور بعض بطون وقبائل عرب کا ذکر معہ اشخاص کے ہے جیسے وفد جرش کا اگلا ذکر ہے۔(۲/۱۴۰۸-۱۴۱۱،حواشی محقق)

ازواج مطہرات: اس باب میں حافظ مغلطائی نے حدیث نبوی: ''فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سایر الطعام'' کی تفسیر سہیلی پر نقد سے آغاز کیا کہ ثرید سے مراد وہ نہیں جو سہیلی نے لی ہے بلکہ اس سے مطلوب ہاشم بن عبد مناف کی مکی قحط میں ثرید کی دعوت قریش ہے جیسا کہ سلیم الرازی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ محقق عزیز نے ثرید اور اس کے مصدر و ماخذ پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا اور یہ بحث قابل تحقیق و استدراک ہے، اس کے بعد آپ کی غیر معروف ازواج کا نام بنام ذکر ہے جو مختلف مصادر کے حوالہ سے ہے اور جن کا شمار آپ کی منکوحات/ ازواج میں نہیں کیا جاتا:

۱۔ اسماء بنت الصلت السلیمہ (الاکلیل) ۲۔ اسماء بنت کعب الجونیہ ۳۔ آمنہ بنت الضحاک الغفاریہ (الکلابیہ، شہرستانی، اشرف الانساب) ۴۔ امیمہ بنت شراحیل (بخاری) ۵۔ سلمٰی بنت نجدۃ اللیثیۃ (شرف المصطفیٰ) ۶۔ صفیہ بنت بشامہ (کتاب المحبر) ۷۔ ضباعہ بنت عامر (ابن عساکر)، ۸۔ عمرۃ بنت یزید (ابن عبدالبر) ۹۔ عمرہ بنت معاویہ (ابن الامین/محقق کے مطابق بروایت ابونعیم)، ۱۰۔ فاطمہ بنت الضحاک (شہرستانی) ۱۱۔ قتیلہ بنت قیس بن معدی کرب (محقق: ابن عبدالبر)، ۱۲۔ لیلیٰ بنت الخطیم (اکلیل) ۱۳۔ ملیکہ بنت داؤد (ابن الامین) ۱۴۔ ملکیہ بنت کعب اللیثی (ابن سعد) ۱۵۔ ہند بنت یزید (ابوعبیدہ) ۱۶۔ نعامہ العنبریہ (ابن الدباغ) ۱۷۔ ام شریک بنت جابر الغفاریہ (ابن عبدالبر)، (۲/۱۴۱۲-۱۴۱۴، حواشی محقق میں سے بعض میں تخریج و حاشیہ نہیں ہے۔ یہ بحث مغلطائی مختلف مصادر پر مبنی ہے اور قابل نقد و تحقیق ہے۔)

آغاز مرض نبوی: آخری بحث مغلطائی ہے۔ اس کے اہم ترین معاملات و امور بھی مختصر بیان ہوئے ہیں اور وہ امام سیرت اور سہیلی کے حوالے سے ہیں جیسے:

۱۔ ابن اسحاق کی حدیثِ استغفارِ اہل بقیع کی شاہد روایات ابن حبان سے لائے ہیں اور حاکم سے بحث کی ہے۔

۲۔ آخری کلام نبوی: ''جلال ربی الرفیع، فقد بلغت، ثم قضی'' کو صحیح الاسناد بتایا ہے، تیمی کی سیرت و روایت سے ابن عباسؓ سے دوسرے کلماتِ اواخر کا ذکر بھی ہے۔

۳۔ آغاز مرض الوفات کی تاریخیں مختلف مصادر سے دی ہیں جیسے واقدی، تیمی، ابن عبدالبر، تمیمی وغیرہ۔

۴۔ واقدی کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد حضرات شیخین کے کچھ

مہاجرین کے مردان کار کے ساتھ داخل ہوکر سلام و نماز جنازہ کا ذکر کیا ہے۔ اور عورتوں بچوں کے نماز ادا کرنے کا ذکر کر کے تاریخ وفات بزار وغیرہ سے دی ہے۔ ۲۱/ رمضان کا بھی ذکر کیا ہے، طبریٰ کی تاریخ ۲/ ربیع الاول پر نقد ہے۔

۵۔ بوقت وفات عمر مبارک پر اختلافِ روایات نقل کیا ہے: ۶۵ سال (صحیح مسلم)، تاریخ بخاری الصغیر بروایت عمارؓ اور اس پر نقد مغلطائی ہے۔ اسی طرح دوسری روایات عمر ہیں۔

۶۔ نماز جنازہ کا آغاز ملائکہ میں سے حضرت جبریلؑ نے کیا تھا اور پھر دوسروں نے پڑھی اور سب کو متابعت جبریلی کی ہدایت کی گئی۔ اسی میں ماجشون کی روایت سے یہ دلچسپ واقعیت بیان کی ہے کہ نبوی نماز جنازہ حضرت حمزہؓ کی طرح ۷۲ بار پڑھی گئی، محقق نے حاشیہ میں تاریخ الخمیس، مغلطائی اور دوسرے مآخذ کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ وفات کے بعد ملائکہ کے سلام وصوت کی آوازیں سنائی دینے اور شخص کے نظر نہ آنے کا ذکر کیا ہے۔

۸۔ وفات کے بعد صحابہ کرام کے غم واندوہ کا مختصر حوالہ ہے اور قبر شریف کے لحدی یا ضریحی بنانے کے مشہور واقعہ کا بھی، اس میں بھی ملائکہ کے غسل دینے اور لحد بنانے کا ذکر ہے اور راوی امام سیرت ابن اسحاق کے شیخ سعید بن عبید السباق کی توثیق نسائی وغیرہ کی صراحت ہے۔

۹۔ "صلاۃ ابی بکر بالناس" کے تحت ایک راوی کا ذکر مع توثیق ہے۔

۱۰۔ آخری مرض میں مسواک کی حدیث عائشہؓ میں اسے حضرت عبدالرحمنؓ سے لینے کا ذکر ہے اور اسی پر کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے۔ (۲/ ۱۴۱۵-۱۴۲۰، حواشی محقق)

تبصرہ وتجزیہ: عام وخاص مصادر سیرت نبوی اور اس کی شروح تنقیدی کے برعکس حافظ مغلطائی کی "الزھر الباسم فی سیر ابی القاسم ﷺ" اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ امام سہیلی کی "الروض الانف" کو بالعموم تجزیہ نگار وسیرت نویس امام ابن ہشام کی "السیرۃ النبویۃ" کی شرح قرار دیتے ہیں۔ شبلی نے اپنے مقدمہ میں اسے سیرت ابن اسحاق کی شرح لکھا ہے اور متاخر تمام مصنّفین کا ماخذ بتایا ہے جس کا قلمی نسخہ ان کے استعمال میں تھا۔ وہ جزوی طور سے بالکل صحیح ہے اور اسی کے ساتھ کامل تبصرہ اور پورا سچ یہ ہے کہ وہ شرح تنقیدی ہے۔ وہ امام ابن اسحاق پر مسلسل نقد بھی کرتی ہے۔ حافظ مغلطائی کی کتاب مستطاب نقد سہیلی کا تنقیدی محاکمہ ہے اور نقد واستدراک کی ایک نئی اور منفرد وممتاز روایت کی

طرح بسیط ڈالتی ہے۔اس امتیازی نوعیت کی بنا پر وہ مصادر سیرت نبوی کے زمرے کی کتاب رہتی ہے اور نہ صرف نقد کی، وہ کتاب ''النقد علی الانتقاد'' کا روپ دھار لیتی ہے۔

موضوعاتی اور تصنیفی لحاظ سے وہ سہیلی کی تنقیدات کی کتابی تالیف کی طریق کا تتبع کرنے کے سبب عام معلومات سیرت سے تعرض نہیں کرتی جیسے امامانِ سیرت ابن اسحاق و ابن ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ'' کی روایتِ بکائی کرتی ہے اور امام ابن ہشام متن امام اول سے الگ اپنا نقد ثبت کرتے ہیں وہ اپنے مصدری متن کی کامل پیروی کرنے کے علاوہ اپنے اضافات و تنقیدات کو خاص اپنے ''اقوال'' سے رقم کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی روایات وغیرہ کو ان کے انگریزی مترجم الفریڈ گیوم (Alfred Guillumme) نے بہ آسانی متن ابن اسحاق کے بعد او اخر میں روایات ابن ہشام کا ترجمہ چھاپ دیا، کتاب الزہر الباسم میں نہ تو متن ابن اسحاق/ ابن ہشام ہے اور نہ متن سہیلی؛ موخر الذکر تنقیدات کے ردو استدارک کے سبب صرف اجزاء بحث ہیں۔

ان وجوہ و اسباب سے یا صرف اسی امتیازی نوعیت کتاب کی وجہ سے ''الزہر الباسم'' سے تمام ضروری واقعات سیرت کی توقع بھی عبث ہے۔وہ ردو نقد سہیلی کے ضمن میں البتہ بہت سے مصادر سے معلومات سیرت و حوادث سوانح و تاریخ ضرور لاتے ہیں لیکن وہ بھی منتخب و پراگندہ ہوتے ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ نقد و استدارک کے جامع طریقہ سے حافظ مغلطائی نئی معلومات و روایات کا ایک قابل فخر و تقلید انبار عظیم لگا دیتے ہیں۔ان کی جمع کردہ معلومات نوادر روایات منفرد متداول مصادر سیرت و حدیث سے ہوتی ہیں جن کو چن چن کر وہ مصادر سے جمع کر کے ایک جگہ لاتے ہیں۔ان کے دوسرے مصادر غیر روایتی قسم کے ہیں اور ان میں کتب نسب، لغات عرب، مصادر سوانح و تراجم، تصانیف شعر و ادب اور کتب دلائل وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے مصادر و مراجع کی بنا پر ہی کتاب ''الزہر الباسم'' بلاشبہ ایک قاموسی کتاب نقد و استدراک سیرت ہے، متداول و معروف مراجع و مصادر کے علاوہ وہ بہت سے ایسے مصادر و مراجع رکھتی ہے جو عام سیرت نگاروں کے بس سے باہر ہیں ہی وہ محققین سیرت کی بساط تحقیق و تلاش سے بھی پرے نظر آتے ہیں۔ان میں وہ مآخذ و مراجع بھی شامل ہیں جو عام طور سے دستیاب نہیں، اور ان سے زیادہ وہ ہیں جو اب مفقود ہیں، اگرچہ ان کے عناوین معلوم ہیں اور سب سے زیادہ تعجب خیز و حیران کن وہ زمرہ مراجع ہے جن کے نام بھی ہم جیسے کوتاہ نظر طالب علم تو درکنار، محققین تک نے نہیں سنے تھے۔کتاب

"الزہرالباسم" کے محقق وحاشیہ نگار اپنی تمام تر مہارت فنی اور تبحر تدوینی کے باوجود ان میں سے متعدد/ بہت سوں کے سراغ لگانے میں کامیاب نہ رہے۔

تدوین وتالیف مصادر سیرت کا معاملہ ہو یا تصنیف وترتیب کا، اشاریہ۔ایک جامع الاشاریات کا حامل اشاریہ لازمی چیز ہے۔وہ اعلام واماکن، مصادر ومراجع اور اشعار وقوافی تک کے الگ الگ اشاریے کو شامل ہوتا ہے اور اکثر اصحاب تصنیف وتحقیق اس کا خیال خاص رکھتے ہیں۔تدوین متن "الزہرالباسم" کی صبر آزما بھول بھلیوں نے غالباً محقق وحواشی نگار کی ہمت مردانہ پست کردی جیسی خاکسار کی اپنی انگریزی تالیف سیرت کے اشاریہ سازی کے جوکھم میں درگت بنی تھی اور وہ عام اشاریہ اعلام بھی مرتب نہ کرسکے، چہ جائیکہ وہ تمام اشاریے مرتب کرتے، اپنے مطالعہ وتجزیہ کتاب کے بعد خاکسار کا خیال ہے کہ مراجع مغلطائی کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس باب میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ یاران نکتہ داں کے لیے اس کی اشاریہ سازی اور صرف مراجع مغلطائی کی مراجع شماری ہی ایک صلائے عام ہونے کے ساتھ ان کی ہمت مردانہ کے لیے ایک چیلنج ہے۔مغلطائی نقد واستدارک کے ہدف "الروض الانف" کے مؤلف گرامی کا یہ اعتراف جیسا کہ شبلی نے بھی لکھا ہے کہ ان کی کتاب ایک سو بیس مراجع کی مدد سے تالیف کی گئی ہے۔مغلطائی کے مراجع کی عددی کثرت ثابت کرنے اور موازنہ سہیلی ومغلطائی کرنے کے لیے ایک دوسرا چیلنج ہے۔

حافظ مغلطائی اپنے نقد واستدراک سے زیادہ اپنی بے مثال وبسیط وعریض مراجع نگاری کی وجہ سے اپنے متاخرین کے لیے خود مرجع بن گئے، اصحاب سیرت وحدیث اور نامور مولفین کتب سیرت میں سے متعدد اصحاب تحقیق وتبحر نے ان کے حوالوں سے ہی اپنی بہت سے معلومات پیش کی ہیں۔ متوسطین میں علامہ دیار بکری (م ۱۵۵۹ء) مؤلف "تاریخ الخمیس" ان میں سے ایک ہیں جو ان کے حوالہ ہی سے اپنی معلومات واخبار پیش کرتے ہیں اور اصل مآخذ کا حوالہ بھی نہیں دیتے کہ وہ ان کے علم وجستجو کے دائرے سے پرے تھے۔ان کے علاوہ دوسرے متاخرین سیرت نگاروں نے بھی مغلطائی کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے، جدید اردو سیرت نگاری کے امام شبلی نے حافظ مغلطائی کا بطور اپنے ماخذ حوالہ دیا ہے اور وہ بھی کسی اور قدیم تر صاحب تحقیق کے حوالہ سے ہی ہے کیونکہ شبلی کو حافظ مغلطائی کی دونوں معروف کتابوں الزہرالباسم اور الاشارہ کا علم تھا، نہ ان پر دسترس، وہ بشکل مخطوطات ہی تھیں۔ دوسرے جدید اردو سیرت نگاروں کو حافظ مغلطائی کا بالعموم علم نہیں مگر بعض بعض نے ان کا حوالہ دیا ہے اور وہ بالعموم

متوسطین کے حوالہ سے ہے۔ ان کی معروف و مطبوع کتاب ''الاشارۃ'' سے بیشتر نے فیض نہیں اٹھایا۔

مآخذ و مصادر ''الزہر الباسم'' جس طرح تعجب خیز ہے اسی طرح کے متعدد مصادر سے اخذ معلومات و روایات باعث حیرانی۔ حافظ مغلطائی نے معتبر و ثقہ مصادر سیرت و سوانح کے دوش بدوش کافی مصادر/ کتب سیرت کا عام استعمال کیا ہے جو محققین کی نظر میں غیر مستند ہیں۔ ان میں سے ایک حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری کی کتاب شرف المصطفیٰ ہے ''جن کا حوالہ حافظ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب صحابہ الاصابہ میں اکثر دیتے ہیں'' اور بقول شبلی ''جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی''۔ صاحب شرف المصطفیٰ کی مانند حافظ مغلطائی کے کئی اور مراجعِ صاحبان رطب و یابس بلکہ امامان روایات فاسدہ ہیں جن سے وہ بکثرت نقل کرتے ہیں، غیر مستند یا رطب و یابس قسم کی روایات نقل ہی کرتے نہیں بلکہ حافظ مغلطائی ان کی صحت و ثقاہت پر اعتبار کر کے اپنے قارئین کو اعتبار کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ناقدین و محققین کو اپنے آپ پر نقد و طعن و استدراک کا موقع۔ وہ اپنے متن سیرت کے امام اول ابن اسحاق کی متعدد واہی تباہی روایات بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ اخذ و نقل روایات اسی وقت قابل قبول ہوتا جب وہ ان کا محاکمہ کرتے اور ان کا تنقیدی تجزیہ کرتے لیکن وہ بالعموم بلکہ بلا استثنا ان پر نقد نہیں کرتے۔ آباء و اجداد خاندانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالخصوص ہاشم بن عبد مناف کے بارے میں ان کی متعدد روایات کثیرہ جن کو شبلی و سلیمان جیسے محققین نے ''منکرات و موضوعات'' کے خانے میں رکھا ہے۔ خاص سیرت نبوی کے بعض واقعات و حوادث کے باب میں بھی روایات مغلطائی کا پایہ اعتبار نہ صرف حدیث کے اعتبار سے بلکہ سیرت کے لحاظ سے بھی ساقط ہے۔

بلا نقد و محاکمہ نقل روایات و احادیث کا فنی سقم ''الزہر الباسم'' کی حد تک ان روایات میں بھی نظر آتا ہے جو واقعات سیرت سے براہ راست متعلق ہیں۔ تاریخ ولادت نبوی، آغاز بعثت و نبوت، تنزیل قرآنی، فترہ وحی وغیرہ متعدد اہم ترین مکی معاملاتِ سیرت ہوں یا مدنی دور کے اہم ترین مباحث جیسے تاریخ و سنن غزوات و سرایا، مرض الوفات و وفات سید المرسلین اور ازواج مطہرات کی آخری بحث وغیرہ میں متعدد متصادم روایات میں محاکمہ نہیں کرتے اور بالعموم کسی ایک کو راجح و اثبت قرار دینے سے گریز کرتے ہیں اور بعض مقامات پر ایسا کرتے بھی ہیں تو بالعموم واقدی جیسے امام سیرت کے حوالے سے کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کا مطالبہ تصنیف و تالیف سیرت کے تقاضے سے بھی بڑھ کر ہے کہ متصادم و

متعارض روایات کثیرہ میں محاکمہ کرکے اپنے خیال وفکر کے مطابق ایک تاریخ وسنہ کی ترجیح ثبت کریں خواہ اسے دوسرے ناقدین ومصنّفین نہ تسلیم کریں۔ امامان حدیث اور قدیم مؤلفین سیرت نے تو اس کی نظیر قائم کی تھی جن میں حافظ مغلطائی کے تینوں امامان سیرت شامل ہیں اور ان کے علاوہ ان کے دوسرے شیوخ کے ساتھ بہت سے امامان سیرت وحدیث وسوانح ان کے مدنظر رہتے تھے۔

امام سہیلی اور ان کی کتاب الروض الانف اصلاً حافظ مغلطائی کے نقد واستدراک کا ہدف ہے اور ضمناً امامانِ سیرت نبوی بھی۔ عام قارئین اور سیرت نگار بالعموم ان کی تمام تنقیدات سہیلی کی صحت کے قائل ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنے زور بیان اور شورِ استدلال سے چھاجاتے ہیں۔ مگر محققین اور ناقدین پر واجب ہے کہ وہ ان کی تمام تنقیداتِ سہیلی کا تجزیہ کریں اور واضح کریں کہ وہ کس قدر ان میں حق بجانب ہیں۔ خاکسار راقم کے اس سرسری مطالعہ اور تعارف سے کئی جگہ احساس ہوا کہ نقد مغلطائی صحیح نہیں ہے اور امام سہیلی کا نقد یا شرح زیادہ صحیح ہے۔ مثلاً فضائل حضرت عائشہؓ میں حدیث نبوی میں وارد لفظ ''ثرید'' کی شرحِ سہیلی بلانقد وشرح مغلطائی کے مقابلہ میں ''اصح'' ہے اور موخرالذکر جانبدارانہ عقیدت کا شکار ہیں جس طرح امام اول جانبداری بنی ہاشم اور امام دوم طرفداری جنوبی قبائل کی عصبیت میں ان کی محبت وعقیدت کی وجہ سے مبتلا تھے اور اس کے سبب غیر مستند روایات دیتے ہیں۔ حافظ مغلطائی کی ایسی طرفداری غالب کی متعدد مثالیں ہیں جو ان کی سخنوری پر حرف لاتی ہیں لیکن ان کی عقیدت ومحبت نے ان کو اموی مخالف نہیں بنایا۔ ان کی کتاب مستطاب میں متعدد مقامات پر اموی خلفا وامرا اور صحابہ و اکابر کے بارے میں ان کی مثبت تاریخی روایات موجود ہیں جو ان کی فطرت سلیمہ کی شاہد ہیں جیسے خلیفہ عبدالملک بن مروان اموی کے فضائل ومناقب بحوالہ کتاب الثقات (۱/۴۴۳-۳) اور قصائد ومدح مروان بن محمد وحجاج بن یوسف ثقفی سے استدلال (۱۰۱۸-۱۰۱۹) وغیرہ۔ سب سے دلچسپ اور اہم حوالہ بدنام ومطعون خلیفہ اموی یزید بن معاویہ کی قرآنی تعلیم وتربیت کے بارے میں ہے۔ (۱/ ۴۳۵) ان کے علاوہ بھی متعدد حوالے دوسرے اکابر کے متعلق ہیں۔

حافظ مغلطائی نے اپنے مختصر مقدمہ میں بیان کردہ اہداف کے مطابق امام سیرت ابن اسحاق کی روایات واحادیث کو مستند بنانے کا ایک ہدف اعظم بنایا تھا اور اس کے مطابق امام موصوف کی بہت سی روایات واحادیث کو صحیح الاسناد ثابت کیا ہے اور اس کے روایتی ودرایتی دلائل دیے ہیں۔ ان کی منقطع، مرسل، مقطوع یا بلاسند احادیث وروایات کو موصول ومتصل اور مرفوع ومسند بنانے کی سبیل

کرتے ہیں اور بالعموم وہ صحیحین سے یا دیگر کتب حدیث وسیر سے ان کو پایہ اعتبار فراہم کرتے ہیں۔ ایسی تمام روایات واحادیث الزہر الباسم کا الگ سے تحقیقی مطالعہ امام سیرت کی توثیق کا ایک دفتر ہوگا۔ خاکسار راقم کو ان کے اس کارنامہ توثیق نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی توثیق امام ابن اسحاق کا نادر و نایاب کارنامہ یاد دلادیا جو حضرت شاہ نے اپنی کتاب تراجم ابواب البخاری میں کیا ہے کہ کتاب المناقب کے بعد بخاری میں وہ تمام ابواب قبل بعثت یا متصل بہ عہد مکی امام نے صرف توثیق امام سیرت میں بیان کیے ہیں کیونکہ امام سیرت ان کو متصل اسناد فراہم نہ کرسکے تھے جو انھوں نے فراہم کردیں بالکل اسی طرح جیسے موطا امام مالک کی تمام احادیث کو دارمی وشاہ وغیرہ نے مرفوع بنایا ہے۔(ملاحظہ ہو: مقالہ خاکسار: امام ابن اسحاق۔شاہ ولی کے اہم ترین ماخذ سیرت، تحقیقات اسلامی علی گڑھ اپریل۔ جون ۲۰۱۲، کتاب خاکسار شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمات حدیث، پھلت ۲۰۱۱/اور متعدد مقالات و کتب سیرت وشاہ موصوف)۔حافظ مغلطائی نے امام سیرت ابن اسحاق کی عام فنی ثقاہت اور تدلیس سے ان کی براءت کا ایک موثر انداز سے اثبات کیا ہے جو ان کے الفاظ میں یہ ہے: ''............ وفیه دلالة علیٰ جلالة ابن اسحاق،وتوقیه التدلیس لان معبد اشیخه ولم یستجز هنا ان یروی فیه عالم یسمع منه الا بواسطة وهذا غایة ما یمدح به الانسان'' (۲/۱۷۴)۔ یہ بیان اصلاً امام ابن اسحاق کے ایک شیخ کے حوالہ سے ہے اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ مغلطائی بالعموم شیوخ ابن اسحاق کی ثقاہت ابن حبان کی کتاب الثقات وغیرہ سے ثابت کرتے ہیں۔امام سیرت کی ثقاہت، صرف سیرت میں ہی نہیں حدیث میں بھی اب مسلم ہے۔

حافظ مغلطائی کی کتاب الزہر الباسم میں امام سہیلی کی شرح سے کسی قدر زیادہ الفاظ وکلمات و اشعار/لفظیات کی تشریح ہے۔وہ عربی ادب وشعر کے عالموں اور طالب علموں اور محققین و ناقدین کے لیے سرمہ بصیرت فراہم کرتی ہے تو سیرت نبوی کے قارئین و مصنّفین و محققین کے سامنے جہات سیرت نئے نئے طریق سے کھولتی ہے۔لفظیات سیرت نبوی کی لغوی و معنوی تحقیقِ مغلطائی سے بہت سی شخصیات عہد کے اسماء وکنیٰ (کنیتوں) کے معانی کھلتے ہیں جیسے احیحہ/ابواحیحہ کے لغوی اور معنوی شرح واطلاق سے مکی نبوی عہد اور قبل بعثت کے بعض اکابر کا سراپا مجسم ہوکر سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ قریش کی مختلف تعبیرات، ابولہب اور غیداق وغیرہ اعمام نبوی کے معانی، ابوطالب کے مدحیہ/نعتیہ قصیدہ کی تشریحات، النذیر العریان کا مطلب، مولیٰ کے معانی، النجار کی شرح، بہت سے اکابر عہد اور

صحابہ کرام کے اسماء و کنیٰ کی لغوی و معنوی تفسیر، آیات قرآنی و احادیث نبوی میں وارد لفظیات کی شرح اور واقعات سیرت کی لفظیات پر بحث اپنے معانی و مفاہیم اور جہات کے لیے ہی اہم نہیں ہے۔ حافظ مغلطائی کی فنی عبقریت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

علم نسب/ الانساب کے باب میں حافظ مغلطائی فنی تبحر اور درجہ امامت رکھتے تھے۔ ان کی ایک صفت نسابہ بھی ہے جو محققین نے لکھی ہے، کتاب مستطاب کے سرورق پر ''الامام والحافظ النسابہ'' کے القاب مغلطائی ان کی قرآنی، حدیثی اور سیرتی و فقہی علوم کی مہارت کے ساتھ علم نسب پر قدرت کے غماز ہیں۔ سیرت نبوی کے تمام زمانی ادوار سے متعلق شخصیات و اکابر، صحابہ کرام و صحابیات طاہرات اور ان کے اور ہمارے سید و آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں وہ علم نسب کے حوالے سے نئی معلومات و نادر جہات سیرت پیش کرتے ہیں اور وہ بلاشبہ اپنے پیش رو اماماں انساب سے اکتساب کر کے ان پر اضافات کرتے ہیں۔ مثلاً مشہور حنیف و شیخ اوس سویدؓ بن صامت یثربی کو جد امجد نبوی عبدالمطلب ہاشمی کا خالہ زاد بھائی ثابت کر کے کئی جہات سیرت کو معنی خیز بنا دیا ہے۔ براہ راست سیرت نبوی اور سیرت صحابہ کرام سے متعلق حافظ مغلطائی کی علم الانساب کی رو سے تحقیقات و تشریحات الزہر الباسم کا ایک اہم ترین پہلو ہے۔

تمام تر نقد و استدراک کے باوجود اور کتاب الزہر الباسم کے صحیح معنوں میں کتاب سیرت نہ ہونے کے باوصف حافظ مغلطائی کی یہ کتاب نقد و استدراک سیرت نبوی کی تفہیم و افہام اور مطالعہ و نگارش کے لیے ایک ناگزیر و لازمی مصدر بن گئی ہے۔ وہ صرف نقد و استدراک روایات سیرت کا صحیح منہج یا مصادر و شروح سیرت کے انتقاد کا علمی طریق ہی نہیں بتاتی بلکہ وہ سیرت نبوی کے وسیع ترین باب میں نئی نئی معلومات، دل لگتی تعبیرات، روایات و اخبار سیرت کے صحیح در و بست، احادیث نبوی کی تفہیمات اور آیات قرآنی کی تفسیرات وغیرہ بھی اپنے طریق سے اجاگر کرتی ہے۔ اس تبصرہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ حافظ مغلطائی کی مختصر کتاب الاشارۃ الیٰ سیرۃ المصطفیٰ الخ، اصلاً ایک کتاب سیرت و تاریخ خلافت ہے اور یہ بھی ایک اہم ترین حقیقت ہے کہ وہ الزہر الباسم سے قبل تالیف کی جا چکی تھی کیونکہ موخر الذکر میں ان کی الاشارہ کا حوالہ آتا ہے۔ اور وہ الزہر الباسم کی تلخیص و خلاصہ یا اختصار نہیں، البتہ وہ ان کے اختصار کا نہادی پتھر ہے کہ اس عظیم قاموسی تحقیق نے اس کا مواد فراہم کیا تھا۔ عام قارئین و مطالعہ و تصنیف کے خوگروں کے لیے وہ کتاب سیرت ہے اور نہ مصدر مگر سیرت نگاروں کے لیے اور محققین سیرت نگاروں کے لیے اب وہ ایک لازمی مصدر بن گئی ہے۔

اقبال شناسی: ایک بحث

☆ پروفیسر محمد حیات عامر حسینی

ہندوستانی تہذیب کی داستان بالکل الگ ہے اور اس تہذیب کے ابتدائی نقوش اس بات کو سامنے لائے ہیں کہ یہاں جو سوال یا جس طرح کے تصورات سامنے آئے وہ یونانی اور دوسری تہذیبوں سے بالکل الگ تھے۔ اس نے ابتدا میں ہی زمین اور آسمان کو (آکاش اور پرتھوی) دیوتا اور دیوی مان کر اپنا تہذیبی اور مذہبی سفر شروع کیا۔ کچھ وقت کے بعد سورج (سریہ دیوتا) ایک عظیم طاقتور دیوتا کی حیثیت سے سامنے آیا۔ پھر تینتیس دیوتاؤں کا تصور سامنے آیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد تینتیس ہزار ہوگئی اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ان دیوی دیوتاؤں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ رگ وید میں دیوی دیوتاؤں کی تعداد پر کوئی ایک رائے نہیں۔ عام طور پر رگ وید میں زمین اور آسمان کو ماں باپ کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں پر سوم اور پشن کو زمین اور آسمان کا تخلیق کار مانا جارہا ہے۔ رگ وید میں ہے کہ دیوی دیوتا فانی ہیں جو زہد سے موت پر قابو پا سکتے ہیں اور کہیں یہ کہا جارہا ہے کہ وہ سوم رس پی کر لافانی بن سکتے ہیں۔

ویدوں میں جتنے دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے ان کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف): آسمانی دیوتا جیسے دیس Dyaus اور پرتھوی، ورن، اندر، پرجاپتی، سوریہ، ساوتری (جو سوریہ کی بیوی ہے)، پشن (بشن؟): اور وشنو۔

(ب): فضائی دیوی دیوتا جیسے اندر، تریتا، رودرہ، وایو، آپھا۔

(ج): ارضی دیوی دیوتا۔ ان میں دریاؤں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کو دیوتا کا درجہ دیا گیا ہے، جیسے سندھو: بیاس، مستدری۔ سب سے اہم دیوی سرسوتی ہے جسے برہمہ کی بیوی مانا جاتا ہے۔ اگنی،

☆ شعبۂ فلسفہ، اے۔ ایم۔ یو، علی گڈھ۔

آ گ کی دیوی ہے اور اسے ایک کلیدی اہمیت حاصل ہے۔

یوں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ویدوں میں خدائے واحد یا توحید کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ بہت کھینچ تان کر کے ناقص توحید Henotheism کی بات کہی جاسکتی ہے۔ یوں یہ تہذیب ابتدا سے ہی مشرکانہ تھی، موحدانہ نہ تھی۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ہندو تہذیب کی ابتدائی کتابیں جو رِشیوں اور منیوں نے لکھیں، ان میں ایک خدا کا کوئی واضح تصور موجود نہیں۔ ان میں بنیادی حیثیت اگنی (آگ) کو حاصل ہے۔ کہیں کہیں اگر خدائے واحد و مطلق کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے تو وہ بہت ہی موہوم ہے۔

ویدوں کی تشریحی جہتیں جو بعد میں اپنشد کی صورت میں سامنے آئیں، ان میں واحد خدا کا سوال یا تصور ایک نئی شکل میں اُبھرتا ہے اور وہ ہے 'برہمن' کا تصور اور برہمن اور آتما اس تشریحی فلسفہ طرازی کی دو بنیادی جہتیں بن جاتی ہیں، جن کے دائرے میں سارا ہندو فلسفہ پھیل جاتا ہے اور اس کا فلسفیانہ اسٹرکچر ان ہی دو بنیادوں پر آگے بڑھتا ہے۔ کرم کا نظریہ ہو کہ آواگون کا، یوگ ہو کہ چارواک کا فلسفۂ مادیت، ایشور کا تصور ہو، کہ نرگن برہمہ کا تصور، غرض جتنی بھی شکلیں اور جتنے بھی نظریات ہیں وہ سب اسی کا انعکاس ہیں۔ ہندو فلسفہ کے چھ بڑے مکاتب فکر ہیں اور ان میں ایک مادی فکر یعنی چارواک بھی ہے جو وید، خدا، روح سب کا رد کرتا ہے۔ ان فکری مکاتب کے ساتھ ساتھ دو کلی طور پر الگ فکری مکتب و مناہج بدھ مت اور جین مت اُبھر کے سامنے آتے ہیں۔ بدھ مت نے زندگی کو ہی تمام مصائب کی جڑ قرار دیا۔ لیکن جین مت کی ایک بہت بڑی دین اس کا نظریہ علم اور معیارات وحیثیات علمی کے تصورات ہیں جسے سیادواد کہتے ہیں۔ جین مت علم کو ایک سطحی یا ایک حوالے کے دائرے میں دیکھنے کا انکار کرتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ حقیقت کو ایک جہت میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ حقیقت کی کئی جہتیں ہوتی ہیں اور ان کو مختلف حوالہ جات کے دائروں میں دیکھنا پڑے گا جب جا کے اس حقیقت کا جواب مل سکتا ہے۔ لیکن دونوں مکاتب فکر کا المیہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کسی حقیقت کلیہ کا وجود نہیں، جو تمام حقائق کی علت بن سکے۔

لیکن مندرجہ بالا دو تہذیبوں یعنی یونانی اور ہندوستانی نے جو سوالات اٹھائے اور ان کی جو تشریحات و تعبیرات کیں وہ بالآخر انہیں ایک ایسی تصوراتی و عملی دنیا میں لے گئیں، جسے ہم شرک کہتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں اسطور اور کہانیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آ گیا، جس کے چکرویو سے وہ کبھی

باہر نہ آ سکے۔ اور یہ اسطور گری شرک کی ایک داخلی مجبوری ہے اور اپنے وجود کے لیے وہ اس کا محتاج ہے۔ اس کی اپنی کوئی حقیقی بنیاد نہیں۔ حقیقت تو صرف اس لامتناہی وجود خالص کو حاصل ہے، جو واجب الوجود ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور جو خالق و مالک کل، ہمہ جا، ہمہ دان اور قادر مطلق ہے۔ ایسے وجود کے لیے نہ تو کسی گورکھ دھندے کی ضرورت ہے اور نہ کسی ثبوت کی۔ وہ تو اپنے آپ میں اپنا اور اپنی ساری شان اور تخلیق کا ثبوت ہے۔

شرک کے مقابلے میں ایک پیغمبرانہ تعلیم کا سلسلہ چل رہا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرور کونین حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس تک۔ ان تمام پیغمبران عظام علیہم السلام کی تعلیم کا مرکزی نکتہ توحید ہے۔ یہاں پر چار بنیادی سوالات اُبھر کے آتے ہیں، جن کی طرف عموماً توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ چیز ملتی ہے۔ جب میں اقبال کی طرف رُخ کروں گا تو میں ان کا تذکرہ بھی کروں گا۔ ہمارے مفسرین نے ان چار سوالات کے فہم میں بڑی ٹھوکریں کھائیں اور یہ ٹھوکریں ابتدا سے ہی شروع ہوئیں۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ قرآن حکیم خدا کا ایک ایسا تصور سامنے لے آتا ہے جس کا آپ کسی حیثیت سے ادراک نہیں کر سکتے۔ وہ تمام کوائف اور تصورات سے بالا و مبرا ہے اور اس کا وجود مطلق خالص ہے اور اللہ اس کا اسم ذات ہے۔ ہم اللہ کو سمجھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں، وہ صفات کے ذریعہ کرتے ہیں نہ کہ اس کی ذات کے ذریعے جس کا ادراک کوئی آنکھ نہیں کر سکتی۔ اس کی صفات کا بھی ادراک ہماری محدود فکر کلی طور پر نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ بھی لامتناہی ہیں اور کوئی متنہائی یا محدود شیئے کسی لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ کلام پاک میں مسئلہ حقیقت وجود Primary substance کہیں نہیں ملتا۔ وہ تو شروع ہی اس بیان سے ہوتا ہے کہ وجود حقیقی صرف خدا کی ہی ذات مطلق ہے اور یہ وجود حقیقی Basic substance ہے جو قادر مطلق Omnipotent بھی ہے اور ہمہ دان Omniscient وہمہ جا وہمہ گیر Omnipresent بھی۔ اس کی ان گنت صفات اور جہتیں ہیں۔ اس نے اپنی تخلیقی فعالیت سے آدم کو پیدا کیا اور اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور اس کو علم، اختیار اور آزادی عطا کی۔ کلام پاک اس تصور خلافت کو ایک نقطہ پر لے آتا ہے اور وہ نقطہ ہے خلافت ارضی کا اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس کا بوجھ اُٹھانے سے سبھی نے انکار کیا سوائے انسان کے یا فرشتوں کے جو نور سے پیدا کئے گئے، ان کا علم اور ان کی ذمہ داریاں محدود ہیں۔ ان سے کوئی جوابدہی بھی نہیں ہوگی

کیونکہ وہ اپنے عمل میں نہیں ہیں۔ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کو بتا دیا گیا۔

یہ ذمہ داری انسان پر ڈالی گئی اللہ نے تخلیق آدم کے وقت فرشتوں سے ان کے استفسار پر یہی کہا تھا کہ ہم نے آدمؑ کو علم عطا کیا، وعلّم آدم الأسمآء ''ہم نے انسان کو علم الاسماء عطا کیا''۔ اسم نام بھی ہے، تصور بھی اور پہچان بھی۔ یوں انسان پر خلافت ارضی وعبودیت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔

اصل میں مسئلہ Conceptnal Frame work تصوراتی دروبست کا ہے۔ یہ صرف انسان کو دیا گیا اور اس تصوراتی دروبست کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کے لیے اسے فہم دی گئی، حواس دیے گئے اور شعور کی قوت عطا کی گئی اور اسے مہلت دی گئی اور یہ مہلت وہ تقدیر یا زمان ومکان کی قید ہے جس میں اسے اپنی ذمہ داری نبھانی ہے۔

انسان کو خلیفہ بنایا گیا، نہ کہ ایک مجرد وجود جو شعور، آزادی اور عمل سے محروم ہو۔ خلافت ارضی اللہ کی وحدت سے انکار نہیں اور نہ یہ اس کی ذات یا اختیارات میں شراکت ہے، بلکہ یہ ایک ذمہ داری ہے، ایک امانت ہے اور ایک امتحان ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آزادی بہت ضروری ہے کیونکہ جواب دہی کا کوئی بھی تصور اس وقت تک بے معنی ہے، جب تک آزادی اور علم نہ ہو۔ اگر ہم آزادی سے انکار کردیں تو جواب دہی کا تصور خود بخود بے معنی ہوجاتا ہے۔ اسی لیے انسان کو اس فرض کی ادائیگی کے لیے چار بنیادی صلاحیتیں دی گئیں: ۱۔ اسے علم دیا گیا ۲۔ اسے خلافت ارضی دی گئی۔ ۳۔ زمین کو اس کا میدان عمل بنادیا گیا اور ۴۔ اسے آزادی دی گئی۔

اسلامی تہذیب وتمدن سلسلہ نبوت سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ اس کی آخری اور مکمل شکل جناب رسالت پناہ ختمی مرتبت احمد مجتبیٰ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت وختم نبوت وتعلیمات میں ہے۔ ایک پیغمبر کی تین بڑی جہتیں ہوتی ہیں: ۱۔ اس کا انتخاب خود خدا کرتا ہے، وہ کسی کا منتخب کردہ نہیں ہوتا۔ ۲۔ وہ معصوم عن الخطا ہوتا ہے اور ہر وقت خدا کی بلاواسطہ نگرانی میں ہوتا ہے، کیونکہ ایسا ہونا اس کے نمونہ کامل ہونے کے لیے ضروری ہے جس کا اتباع کیا جائے۔ ۳۔ اس کا علم اپنے زمان ومکان کی حدود کے مطابق مکمل ہوتا ہے یعنی جو پیغمبر جس زمانے میں آیا، جتنا علم اس زمانے میں تھا اور جتنا علم اس وقت ضروری تھا وہ اسے عطا کیا گیا۔ کسی مخلوق کا کل علم اس کے علم کے ایک چھوٹے سے حصے کے برابر بھی نہیں ہوتا اور یہی اس کا معجزہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود پاک ہی معجزہ ہوتا ہے یعنی عاجز کرنے والا۔

لیکن یہ معاملہ جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں۔ آپ کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم بنادیا۔ آپ ہر پیغمبر کی سطح سے بہت ہی بالا و افضل ہیں۔ اور علوم اور اخلاق عالیہ کے تمام دائروں کو گرفت کئے ہوئے ہیں۔ He comprehend the entire systems of knowledge پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام چیزوں کا علم عطا ہوا تھا۔ جو رہتی دنیا تک کے انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے لیکن ان کی تفصیل کا بیان ضروری نہیں تھا، کیونکہ انسانیت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ علوم و اسرار انسان کی ضرورت کے مطابق وقت وقت پر کھلتے جائیں گے۔ قرآن پاک کا اجمال اور آپ کا طریقہ و سنت پرُ جمال (جو کئی جگہوں پر تفصیل کا حامل ہے کہ ان کا ایسا ہونا ضروری تھا) اس بات کا متقاضی ہے کہ ارتقائے علوم انسانی کے لیے، آپ کی امت کو اجتہاد کا حق بھی دیا جائے۔ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی و رسول ہیں اور آپؐ کے بعد اب کوئی پیغمبر نہیں آنے والا، اس لیے پوری اُمّت اجتہاد کی حامل قرار دی گئی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر ایک شخص کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ہر انسان نہ تو علمی طور پر اتنا بلند ہے اور نہ اخلاقی طور پر اتنا اعلیٰ اور نہ ہر ایک کی فہم و فراست اس درجہ ہے کہ قرآن و حدیث کی تشریح کرے۔ یہ تو خدائی علوم ہیں۔ عام انسانی معاملات اور علوم میں بھی ہر ایک کو اس طرح کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ اجتہاد کے لیے کچھ بنیادی اُصول اور شرائط ہیں، جس شخص میں علم، تقویٰ اور فقہ جسے ہم تفقہ کہیں گے، نہ ہو تو اجتہاد کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بحیثیت انسان ہم سارے انسان اللہ کے خلیفہ ہیں، لیکن کتنے انسان ایسے ہیں جنھوں نے خلافت کا حق ادا کیا۔ حقیقی خلیفہ اعظم تو پیغمبر اعظم و آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور تصوف کی زبان میں وہ واحد خلیفۃ اللہ ہیں اور اس کی Justification تائید خود قرآن پاک کر رہا ہے۔ قرآن پاک میں آپؐ کو اللہ نے 'عبدہٗ' کہا ہے۔ ساری مخلوقات بشمول پیغمبران عظام خدا کے بندے ہیں، لیکن کسی کے لیے 'عبدہٗ' نہیں کہا گیا۔ یہ لفظ صرف اس عظیم شخص کے لیے کہا گیا جسے ارض و سماوات، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے جانتے ہیں۔

اسی اللہ کے حقیقی خلیفہ، خاتم الانبیاء والمرسلین نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی اور اسے استوار کیا۔ آپؐ کے ماننے والے آپ سے تربیت حاصل کرتے رہے اور یہ تہذیب بہت تیزی سے پھلتی پھولتی رہی، اتنی تناور تہذیب جس نے تھوڑے سے عرصہ میں ساری دنیا کو اپنی رحمت کے سایہ

میں لے لیا...... اور جب تہذیبیں پھولتی ہیں، ترقی کرتی ہیں تو سوالات پیدا ہوجاتے ہیں اس کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ کیونکہ تہذبیں جامد ہوکر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جو تہذیب جامد ہوجاتی ہے وہ مرجاتی ہے۔ تہذیبوں کے ارتقاء کے ساتھ ان کا رابطہ اور مجادلہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ ہوتا ہے، اور جب ایک تہذیب دوسری تہذیب یا تہذیبوں کے (Interact) رابطہ میں آجاتی اور اس کے یا ان کے ساتھ مجادلہ آرا ہوجاتی ہے تو مسائل کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ایک زندہ تہذیب ان سوالات کا جواب دیتی ہے، جواب تلاش کرتی ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوجائے تو وہ جمود اور پستی کا شکار ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ عملی، نظریاتی اور نفسیاتی طور پر مغلوب ہوجاتی ہے۔

پیغمبر اعظم و آخر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اسلامی سماج میں ایسے حالات اور ایسے مسائل اور سوالات پیدا ہوگئے، جن سے مفر ممکن نہ تھا۔ پہلا سوال Justification استناد اور تائید کا تھا۔ سوال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی نیابت کا حق کسے ہے؟ یہ سوال دو جہتوں میں مسلمانوں کے اندر پھیل گیا، ایک جمہور (Democratic line of action) اور دوسرا Theocratic (جس میں ایک فرد یا ایک طبقہ دین و دنیا کی حکمرانی کا حامل ہوتا ہے) اس تاریخی موڑ پر جو ہوا اس پر ہم بحث نہیں کریں گے، لیکن آگے جو حالات پیدا ہوئے ان سے پانچ بڑے سوالات پیدا ہوئے: ۱۔ مسئلہ جبر و قدر ۲۔ ریاست کی ضرورت اور حکمراں کی صفات ۳۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کی حیثیت ۴۔ عمل اور ایمان کی حیثیت اور ان کا تعلق ۵۔ امامت اور خلافت کی حیثیت۔ یہ پانچ بڑے سوالات تھے اس وقت پیدا ہوئے اور المیہ یہ ہے کہ ان سوالات کی بہت ہی غلط اور خودساختہ تشریح کی گئی اور قرآن پاک کی آیات بینات اور سنت مقدسہ سے انحراف کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی، کچھ متعلقہ طبقوں نے کلام پاک کی آیات سے جو ادراک کیا، وہ سطحی اور کئی دیگر آیات بینات سے انحراف تھا۔ خلافت کا تصور یا خلافت ارضی کا تصور خود اس حقیقت کو ظاہر و لازم کرتا ہے کہ انسان کو آزادی دی گئی ہے لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ انسان خلیفہ ہے، حقیقی حکمراں نہیں۔ اسے جو اختیارات دیے گئے وہ محدود ہیں، لامحدود نہیں اور یہ آزادی کچھ علمی اور عملی دائروں میں ہی سفر کرے گی۔ جہم بن صفوان نے اس آیت ان اللہ علی کل شئی قدیر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔ یوں اس نے 'جبر' یا 'جبریت' کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مقابلہ میں قدر کا فلسفہ

پیدا ہوا۔ قدریہ نے ٹھیک وہی غلطی دہرائی جس کا ارتکاب جبریہ نے کیا تھا۔ انہوں نے انسان کی مطلق آزادی کا فلسفہ دیا۔ انہوں نے نہ تصور خلافت کو سمجھا اور نہ کلام پاک کی دوسری آیات کو، جو انسان کے علم، اختیار اور جوابدہی سے متعلق تھیں۔ خلافت کا تصور بجائے خود کئی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً، الف: کہ اختیار مطلقہ کا مالک کوئی اور ہے، خلیفہ کے پاس صرف کچھ اختیارات ہیں۔ ب: وہ حقیقی حکمراں نہیں بلکہ نائب ہے۔ ج: اس کا علم محدود ہے، علم حقیقی اور لامحدود علم کا مالک کوئی اور ہے۔ د: وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ ہ: مطلق آزادی، صرف وجود مطلق کا حق ہے کیونکہ وہی قادر مطلق، ہمہ داں اور ہمہ جا و ہمہ گیر ہے۔ جبکہ انسان کے پاس ان صفات میں سے کچھ بھی نہیں۔

اور بجائے خود یہ حقیقت واضح ہے کہ انسان کا جسم اس کی تحدید کرتا ہے، جبکہ مطلق آزادی ہر تحدید سے انکار ہے اور یہ صرف اس کا حق ہے جو زمان و مکان اور جسم اور دیگر تمام قیود کا خالق و مالک ہے لیکن ان سے مبرا و منزہ ہے۔

اسی حقیقت کو حضرت علیؓ نے ایک شخص کو سمجھایا تھا۔ آپ نے اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی آزادی کی حد کیا ہے، اسے یہ فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اُٹھائیے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے اسے فرمایا کہ اب دوسری ٹانگ بھی اُٹھائیے۔ اس شخص نے ایسا کرنے سے یہ کہتے ہوئے معذوری ظاہر کی کہ پھر تو وہ گر جائے گا، کھڑا نہیں رہ پائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی تمہاری آزادی ہے۔ انسان کی آزادی محدود ہے، مشروط ہے، مطلق نہیں۔

اقبالؔ نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھا۔ اسی لیے وہ تقدیر کو Orbit سمجھتے ہیں جس کے گرد انسان کی پوری حرکت ہوتی ہے۔ لیکن حرکت کا یہ تناظر بدل سکتا ہے اگر یہ قطر پھیل جائے۔ انسان کی محدود آزادی ایک بہت بڑی حد یا سطح پر جا سکتی ہے اور وہ حقیقی نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے اس کے لیے اطاعت اور ضبط نفس (تزکیۂ نفس) بہت ضروری ہیں۔

اس کی حیثیات کے صحیح فہم کے لیے انسان کو تصوف کے میدان میں جانا پڑے گا اور قطب کے فلسفہ کو سمجھنا پڑے گا۔ قطب وہ Diacritical Point بنتا ہے جس کے گرد ساری کائنات گھومتی ہے۔ یعنی انسان کی بنیادی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ ہے۔ ساری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی۔ یہاں پر دو چیزوں کی طرف اشارہ کروں گا! ا۔ تسخیر کا تعلق Scientific Wisdom کے ساتھ

ہے صرف مذہبیات سے نہیں۔ اگر آپ نری مذہبیات کے دائرے میں گرفتار ہوکر رہ گئے تو آپ اس بڑے نقطے سے انحراف کر رہے ہیں جسے ہم اللہ کی عطا کردہ امکانی تخلیقی قوت اور تخلیقی امکانات کہہ سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے اسے انسانی تقدیر کہا۔ ۲۔ تقدیر کوئی تراشیدہ شے نہیں وہ امکانات کی کائنات ہے جو انسان کو عطا کی گئی۔ اب اس کائنات کا ادراک اس کے ذمہ ہے۔ یہی امکانی صلاحیت Creative Potentiality پھر تخلیقی عمل یا حقیقت Creative activity بن جاتی ہے۔ اگر آپ کا فہم، علم، ہنر اور ہمت آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو پھر یہ کوئی خواب نہیں رہتی بلکہ حقیقت بن جاتی ہے اور اللہ کے فرمان عالی شان کے مطابق انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے، لیس للانسان الا ماسعیٰ۔

سماجیات، سائنس، قوانین، مذہبیات، فن اور دیگر علوم وفنون انسانی فکر کے دائرے ہو سکتے ہیں۔ ان سب کو آگے بڑھانے اور استوار کرنے کی کوشش انسان کا فریضہ ہے۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ قرون اول میں جملہ علوم کے حصول، ان کی پرداخت اور ان کی ایک نئی تہذیب وترویج وتشریح ہوئی۔ ان کی مختلف الجہت حیثیات کو سامنے لایا گیا۔ جب تک اسلامی تہذیب عربوں کے اختیار اور دائرے میں رہی سائنس اور دیگر علوم سائنسی بنیادوں پر آگے بڑھتے رہے۔ ریگستان کے یہ تہذیب ساز جانباز بہت ہی سائنٹیفک تھے، ان کے یہاں اسطورگری اور جھوٹے خواب دیکھنے کا کوئی موقع اور شوق نہیں تھا۔ ریگستان کی سخت زندگی گزارنے والے عمل کے خوگر تھے اور ان کا تہذیبی پس منظر اسی جفاکوشی اور سخت جانی کا بیان ہے اور ایسے پس منظر کے لوگوں کو ہمیشہ باعمل ہی رہنا پڑتا ہے ورنہ وہ اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ابویعقوب الکندی کے سوا ابتدائی ایام میں کوئی دوسرا عرب فلسفی نظر نہیں آتا۔ ہماری فلسفیانہ جہتیں بہت بعد میں اُبھرتی ہیں اور وہ بھی ایران میں۔ فارابی، ابن سینا، مسکویہ اور بعد میں غزالی کا تعلق بھی ایران ہی سے تھا۔ اس زمانے میں بڑی بڑی عبقری شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن ان میں دو بڑی شخصیتیں ایسی ہوئیں جن کے ساتھ ہم نے آج تک انصاف نہیں کیا اور جن کو سمجھنے کے متحمل ہم آج بھی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علمی ڈھانچہ اتنا وسیع اور بڑا تھا کہ ہم نے ان کو نظر انداز کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ یا یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کو مطعون کردیا، یا ان کی خودساختہ اور غیر مطلوبہ تشریحات کیں، یا ان کو برباد کرنے کی سعی لاحاصل کی یا ان کو اپنے یا غیروں

کے تراشیدہ مفروضات کے خول میں دفن کردیا۔ وہ دو بڑے نام ہیں ابوحامد محمد الغزالی اور محی الدین ابن عربی لیکن ابن عربی سے پہلے ایک اور نام ابھر کے آتا ہے، شہاب الدین سہروردی المقتول۔ یہ ہماری علمی، فلسفیانہ و متصوفانہ وراثت کی تیسری سمت ہے۔ اس کے فلسفہ کو فلسفہ نور کہتے ہیں۔ اس کے ابتدائی خدوخال تستری اور حلاج نے سنوارے۔ یہ فلسفہ اقبال کے ہاں ایک نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ فلسفہ نور کا اساسی مسئلہ نور محمدیؐ کی صورت گری ہے اور یہی اس فلسفہ کا مرکزی نکتہ بھی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ 'طواسین' کو سمجھنے والے اس وقت بھی عنقا تھے اور آج بھی عنقا ہیں۔ اور جنہوں نے اس کو سمجھا وہ اس کی تعبیر و تشریح کرنے کے متحمل ہی نہ تھے۔ امام غزالی نے مشکوٰۃ الانوار میں مسئلہ نور کی تشریح کی، لیکن غزالی کا سب سے بڑا المیہ اس کی وسیع، بے انتہا اور بہت عمیق استنادی سطح Level of Refrence اور علمی سطح Level of academics ہے۔ اس نے تمام جہات کو سمیٹنے اور سمجھنے کی کوشش کی، جس کو پانے اور سمجھنے کے دوسرے متحمل نہ تھے۔ ان کا فلسفیانہ وروحانی ارتقا بھی ان کی اسی وسعت علمی و روحانی اور کثیر الجہت فلسفیانہ و عالمانہ ڈھانچے کا مظہر ہے۔ ان کی فلسفیانہ منہاج اور عمق کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ ان کی علمی، لسانی، نفسیاتی اور فلسفیانہ تحلیل آج بھی مغربی منہاج سے بہت آگے ہے۔ بیکن، ڈیکارٹ، کانٹ، اور وٹسگنسٹین جن نکات پر بحث کررہے ہیں اور اس میں جن مناہج کا استعمال کررہے ہیں، وہ سب غزالی کے ہاں ان سے زیادہ اہم اور وسیع صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب المنقذ من الضلال ان کے فلسفیانہ، علمی اور روحانی ارتقا کا بیان ہے لیکن اس کتاب کے وہ مباحث جن میں انہوں نے فلسفہ، علم الکلام، تصوف اور تعلیمی مکتب خیال پر بحث کی گئی ہے چشم کشا ہیں، ان کی تہافتہ الفلاسفہ میں جس طرح یونانی فلسفہ اور مسلمان فلاسفہ کے اہم مباحث اور اصولوں پر بحث کی ہے اور جس طرح ان کی تحلیل کرکے ان کے تار پود ہلادیے ہیں۔ اس کا جواب آج بھی مغربی فلاسفہ نہ دے سکے۔ کانٹ نے تو ان کا تتبع کیا ہے۔ احیاء العلوم تو فلسفیانہ صنعت گری اور تحلیلی منہاج کی معراج ہے۔ کاش! اسی عمق اور وسعت نظری سے ان کی حیثیت کا بیان کیا گیا ہوتا۔

یہ مسئلہ اقبال کے ساتھ بھی ہے۔ اگر اقبال کا فلسفہ اور ان کی منہاج اور ان کے تصورات کا بیان اور تجزیہ یک رخی ہوتا تو اس کو سمجھنا بہت آسان ہوتا۔ المیہ یہ ہے کہ اقبال کو ہر ایک نے اپنی مخصوص عینک سے دیکھا۔ کسی نے اس کو ملا بنادیا، کسی نے مارکسی، کسی نے ادیب، کسی نے شاعر، لیکن کسی نے اسے اقبال

کی حیثیت سے نہیں دیکھا۔ ان کے فرسودہ نظریات اور خودساختہ تشریحات کے خول میں اقبال کھو گیا۔

مسجد قرطبہ کا ایک شعر ہے:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

یہ ایک عظیم تہذیب کا نوحہ ہے۔ یہ اس تہذیب کا نوحہ ہے جو اقبال کی فکر کی جان اور اس کے فلسفۂ زمان ومکان کی روح ہے اور یہ اس کی تخلیقی رو (مسجد قرطبہ) کا ایک ایسا مقام Juncture ہے جہاں پہ آ کر اقبال اس داستان کو بیان کر رہا ہے جس کی امین اندلس کی مسحور کن فضائیں اور ہوائیں اور خون مسلم سے رنگین باغ اور عمارتیں ہیں۔ لیکن آج بھی ہم اندلسی تہذیب کے اس نقطے پر آ کر اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ اقبال کے فلسفہ زمان ومکان کو اور نہ اس تاریخی حرکت Historical Movement کو جو اس میں پوشیدہ ہے۔ اصل میں مسئلہ تاریخی حرکت کا ہے۔ تاریخ کیسے حرکت کرتی ہے اور وہ کون سے اسباب وعلل ہیں جو تاریخ کو حرکت دیتے ہیں اور وہ کون سے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ تاریخی حرکت کے ابعاد اور حرکت کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس راز کو سمجھنے والا اور اس کی معتبر تشریح کرنے والا ایک عظیم ذہن ملّت نے پیدا کیا۔ لیکن اس کو مسلمانوں نے نہ سمجھا اور نہ دریافت کیا اس کے نظریات کو کھولنے کی مغرب نے کوشش کی وہ تھے فلسفۂ تاریخ اور سماجیات کے موجد ابن خلدون، جن کی المقدمہ آج بھی سماجی علوم پر ایک عظیم حوالہ جاتی مصدر علمی ہے اور جب اقبال تاریخ کے فلسفہ کی بات کرتے ہیں تو ان کے سامنے ابن خلدون کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ اگر اقبال کے فلسفہ تاریخ یا فلسفہ مذہبیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ابن خلدون کے فلسفے کو سمجھنا پڑے گا اور ابن خلدون سے پہلے قرآن حکیم میں غوطہ زن ہونا پڑے گا کہ ابن خلدون اور (اقبال کا بھی) فکری ماخذ یہی الٰہی پیغام ہے۔ قرآن حکیم کی کئی آیاتِ مبارکہ ہیں جو اجل، وقت، ایام اللہ اور حرکت تاریخ کو بیان کرتی ہیں:

”ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک گھڑی مقرر ہے پھر جب کسی قوم کی مدت آ پوری ہوتی ہے تو ایک بھر کی تاخیر وتقدیم بھی نہیں ہوتی۔“ (۷:۳۴)

”اور نصیحت دے ان کو سات دنوں یعنی کاموں خدا کے بیچ اس کے نشانیاں ہی واسطے صبر کرنے والے کے“ ”اب اپنی کمائی کے نتیجہ ہی عذاب کا مزہ چکھو۔“ (اعراف، ۷:۳۹)

”جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کئے ہیں اور اس باب میں ہم ہر ایک

کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہ اہل جنت ہیں۔'' (۴۲:۷)

''اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انہیں تاریخ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کر۔ ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہے۔'' (۱۴:۵)

ہر قوم کے لیے متعین وقت اور اس کے عروج و زوال کے قرآن حکیم نے کچھ شرائط بتائے ہیں اور بار بار مختلف مقامات پر ان کی نشاندہی کی ہے۔ یہ داستان پیغمبران عظام کی داستان اور پیغام سے وابستہ ہے اور اس کا اطلاق پیغمبر اعظم وخاتمؐ کی امت پر بھی ہے کہ وہ آخری حجت اور شاہد و مبشر و نذیر و ہادی کی اُمّت ہے جو کشمکش حیات کی روح ہے اور آپ کی امت خیر امت ہے اس لیے اس کی حرکت عملی و معنوی کا حساب بھی انتہائی سخت ہوگا۔

غزالی کے ساتھ یہ المیہ بھی ہوا کہ اس کو سمجھنے والے لوگ ہی نہیں ملے۔ ایک ابن رشد ملا تھا لیکن وہ Paripatitics کے بھنور میں ایسا پھنس گیا کہ وہ غزالی سے ہی انکار کر بیٹھا مجھے اس کی عقلیت پسندی اور تحلیلی منہاج سے انکار نہیں۔ اس کی واضح اور قوی علمی جہتوں سے بھی انکار نہیں، اس بات سے بھی انکار نہیں کہ وہ بہت بڑا قانون داں اور قاضی تھا، اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ ایک عظیم فلسفی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ افلاطون، ارسطو، فارابی اور ابن سینا اور Paripaticism سے مرعوب تھا۔ اگر اس نے اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہوتی اور اس منہاج اور اس عظیم فلسفیانہ وروحانی اساس کو سمجھ لیا ہوتا جو غزالی کی احیاء کی بنیاد ہے اور روح بھی ہے تو نہ صرف ہمارے فلسفہ بلکہ فلسفیانہ وروحانی وتہذیبی حرکت کا محور ہی بدل گیا ہوتا۔ المیہ یہ ہے کہ مغرب میں کانٹ نے وہی کچھ کیا جو غزالی اس سے چھ سو سال پہلے کر چکے تھے یعنی عقل کی نارسائی، مابعد الطبعیات کی بے کسی، اخلاقیات کے مباحث وغیرہ وغیرہ کا ایک مدلل تحلیلی جائزہ اور ان کی تنقید اتنا ہی نہیں بیکن، ڈیکارٹ، لائبنز اور ہیوم کا فلسفہ تو خود غزالی سے استفادہ ہے۔ تشکیک کی منہاج، علت و معلول کا انکار، مونوڈالوجی، عقل کی نارسائی اور عقل عملی سے آگے وجدان بحیثیت ذریعہ علم اور لسانی وتصوراتی تحلیل، یہ سب تصورات غزالی نے بہت پہلے دیے لیکن یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ زوال پذیر مسلمان اس چیز کا متحمل ہی نہیں تھا کہ وہ ان حقائق کا ادراک کر سکے۔

جدید مغربی فلسفہ کی اساس کانٹ کا فلسفہ ہے۔ کانٹ نے جس شدت سے عقل کو تنقید کا نشانہ

بنایا اور جس طرح قدیم فلسفیانہ روایت کی تنقید کی اور منہاج و دلائل فلسفہ کا رد کیا، مغرب نے اس کو سمجھا اور نئے نظام ہائے افکار کو استوار کیا۔ یہ اس کی زندگی اور حرکت کی دلیل ہے۔ اس نے کانٹ کو سراہا، مطعون نہیں کیا۔

لیکن اسلامی دنیا کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے غزالی کو سمجھا ہی نہیں، اس کی فکری و علمی وسعتوں کا اندازہ ہی نہیں کیا اور اس کی تنقید و تحلیل پر نئے فکری نظام کو استوار کرنے کے بجائے اس پر اسلامی دنیا میں فلسفہ کی بیخ کنی کا جھوٹا اور بدبختانہ الزام لگایا۔ مغرب نے اس سے استفادہ کیا اور ہم اس سے بہت دور جا پڑے۔ الزامات کو صحیح مان لیا اور ان حقائق سے انحراف کیا جو ہمارے تہذیبی انحطاط و زوال کا اصل سبب بنے۔ ہم نے اسلامی تہذیب کی روح اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کے بجائے اس کے دشمنوں کی غلامی اختیار کرلی۔ شاید زوال آمادہ افراد و اقوام کا طریق اور نصیب یہی ہوتا ہے۔

ابن عربی کا معاملہ انتہائی پیچیدہ ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک انتہائی مشکل روحانی مابعدالطبعیات اور علمیات میں الجھا ہوا ہے۔ اس کی پیش کردہ مابعدالطبعیات اور علمیات اتنی پیچیدہ ہیں کہ ان کو سمجھنا بہت ہی رسا ذہنوں کے لیے بھی مشکل ہے، عام انسان کے تو بس کی بات ہی نہیں۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کو گرچہ صوفیہ نے انتہائی اہمیت دی، لیکن ان میں بھی کتنے ایسے تھے، جو ان کی گرہ کشائی کرسکے۔ حضرت جامی، حضرت میر سید علی ہمدانی، حضرت سید گیسو دراز اور چشتیہ سلسلہ کے دوسرے اکابر اور دور جدید میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، اور مغرب میں چٹک، آربری، نکلسن اور اس کے شاگرد عفیفی نے ان مشکل کتابوں کی شروح لکھیں اور ان میں پوشیدہ فلسفہ کو سامنے لائے لیکن پھر بھی ان کی گرہ کشائی ہنوز ایک معمہ ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے اس فلسفہ کا ابطال کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کے پیش کردہ وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود میں تطبیق کی ایک مشکل کوشش ضرور کی، لیکن دریا کے یہ دو کنارے کہیں مل نہیں پائے۔

فصوص الحکم کا تعلق پیغمبران عظام علیہم السلام کے مراتب عالیہ کے بیان سے ہے اور ہر باب ایک پیغمبر عالی مقام کے بنیادی صفت کا بیان ہے۔ ان پیغمبران عظام میں رسالت پناہ ختم مرتبت حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بھی ہے، جو ان تمام صفات کی جامع ہے جو تمام پیغمبروں کو حاصل ہیں۔ فصوص الحکم کو سمجھنے والے عبدالکریم جیلی نے 'انسان کامل' پیش کیا لیکن یہ ایک معمہ سے دوسرے معمہ کی طرف سفر ہے۔ بڑے صوفیہ نے اس کتاب اور ان حقائق کو ضرور سمجھا ہوگا

لیکن یہ شاید ان کے بس میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سطح اور ان تجربات کا بیان کرسکیں۔ معاملہ یہ ہے کہ وجدان ایک بلاواسطہ، فوری اور ذاتی تجربہ و انکشاف علم و حقائق ہے لیکن اس کا مرتبہ وحی کا نہیں، جسے اللہ ذوالجلال نے انسانوں کے لیے قابل فہم اور قابل عمل بنایا۔ صوفیہ ایک دوسرے کے تجربات کو اپنی اکتشافی سطح یا وجدانی سطح پر ضرور سمجھتے ہیں، لیکن عام انسانوں کے لیے اس کا حصول ممکن نہیں اور کبھی ان کا اظہار بھی کریں تو یہ ان کے لیے ایک معمہ ہی ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سامنے ایک ایسا فلسفہ آ گیا یا لایا گیا جس کی جہتیں نو افلاطونیت اور ویدانت سے ملتی ہیں۔ حالانکہ وحدۃ الوجود نہ تو نو افلاطونیت ہے اور نہ ویدانت۔ اس کی طرف نکلسن نے واضح اشارہ کیا ہے۔ وہ وحدۃ الوجود کو Pan theism نہیں مانتے بلکہ اسے Panentheism کہتے ہیں۔ اب Panentheism کی کون کون سی جہتیں آپ تسلیم کریں گے؟ کیونکہ ابن عربی کے ہاں مسئلہ اشراق کا بھی ہے، قطب کا بھی ہے اور انسان کامل اور انسان کی خلافت کا بھی۔ پیغمبر اعظم و خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے فلسفہ کا مرکزی نکتہ ہیں، وہ نور اول، عقل اول ابوالآدم، قطب اور سرا کبر ہیں۔

یہ سارے مسائل الجھ کے سامنے آتے ہیں۔ اب معاملہ اتنا ہی ہوتا تو آسان تھا لیکن فلسفۂ ظل نے اسے اور پیچیدہ بنا دیا۔ اس کے ذریعہ اس نے خدا اور انسان کو مماثل کردیا، جو کلی طور پر توحید کے بنیادی دروبست Structure کے خلاف ہے۔ حالانکہ وہ موحد ہیں مشرک نہیں ہیں۔ انہوں نے جو کیا اس کی توجیہات کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اصل میں ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ کسی معمہ کی طرف جارہے ہیں۔ جو شرک سے مشابہ ہو رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ان کی روحانی تجربہ کی سطح انتہائی اعلیٰ اور ناقابلِ گرفت ہے اور اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ نور مطلق، وجود مطلق، علم مطلق اور ہمہ جائی کا تعلق لامتناہی وجود سے ہے یہ ناقابل گرفت ہیں۔

منصور حلاج کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس نے انا الحق کہا۔ انا الحق کے کیا معنی ہیں۔ لوگوں نے کیا سمجھا اور کس بنیاد پر اسے سولی پر لٹکا دیا، ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ اقبال نے اس کی بہت اچھی تشریح کی ہے۔ انہوں نے انا الحق کو I am the truth ''میں حق ہوں'' کے بجائے I am the creative truth ''میں تخلیقی حق ہوں'' کہا۔ یہاں یہ بات کہنے میں مجھے تامل نہیں کہ روحانی تجربات بہت وسیع ہوں اور حقائق کا ادراک بہت گہرا ہو تو اس کا کچھ بیان ہوسکتا ہے، لیکن یہ

بیان بھی تمثیلی ہوگا، حقیقی نہیں کیونکہ عام الفاظ اور بیان اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ زبان و بیان کی اپنی نزاکتیں ہیں۔ اگر کسی شخص کی ان پر بھرپور نظر ہو تو حقائق کی فہم، ان کا انکشاف اور بیان اس کے لیے کشف الاسرار کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

اقبال کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ اگر اقبال کے بیانیہ کو نہیں سمجھتے، ان کی زبان کو نہیں سمجھتے تو آپ کیسے اس کے فلسفیانہ دروبست Philosophical Structure اور اس کے معانی کا ادراک کرسکتے ہیں جو اس بیان میں آرہا ہے۔ اور اگر آپ اسے کھینچ تان کر سمجھنے کی کوشش کریں گے تو یہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اور اقبال کے ساتھ یہی بے انصافی ہوتی آرہی ہے۔ اس کے بنیادی اسٹرکچر کو نہیں سمجھا جارہا ہے جس کا ایک وسیع خاکہ اقبال کے خطبات میں موجود ہے۔ غزالی کا المیہ یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد اسلامی تہذیب بکھر کے رہ گئی اور اقبال کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی تہذیب کا نمائندہ بن کے آیا جو بکھر چکی تھی۔ وہ اس تہذیب کی احیائے نو کے لیے کوشاں ہیں۔

اقبال کے سامنے مسئلہ قوت کا ہے۔ کیونکہ قوت ہی افراد و اقوام کے وجود کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس مسئلہ قوت کو دو عبقری شخصیات نے سمجھا، سرسید احمد خان اور علامہ محمد اقبال نے۔ سرسید نے اس پورے اسٹرکچر کو علمیاتی بنیادوں پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی بنیادی منہاج عقلی اور سائنسی تھی۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ یہ تھا کہ سائنسی علوم اور عقل اور منطق کے ذریعہ ہم اپنے سفر اور منزل کا تعین کریں۔ ہم مجادلہ آرائی کے متحمل نہیں ہیں۔ ہم اقتدار کھو چکے ہیں اور ہماری سیاسی قوت پارہ پارہ ہوچکی ہے۔ ضمناً سیاسی طاقت کے متعلق ایک بات بتادوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سیاست دین کا حصہ نہیں ہے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ایک تہذیب کی نمائندہ اور اس کی محافظ اس کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ دنیا سے بات کرتی ہے اور اس تہذیب کو دنیا سے جوڑتی ہے۔ یہ اس تہذیب کی روحانیت اور تعلیمات کو جلا بخشتی ہے اور اس کی تبلیغ کرتی ہے۔ طاقت کو محض روحانی طاقت سمجھنا ایک ناقابل معافی غلطی ہے۔ قوت اقتدار کا نام ہے اور اقتدار ریاست و حکومت کے بغیر بے معنی ہے۔ 'قوت' کے تصور اور اس کے معانی اور اطلاقات و انسلاکات پر آنکھیں بند کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ دنیا میں وہی قومیں امامت کے منصب پر فائز ہوتی ہیں جو قوی ہوتی ہیں اور قوت کے ہر پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہیں۔ ساری دُنیا اس وقت مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہے، کیونکہ وہ قوت کا مرکز ہے۔ نظریات،

معاشیات، سماجیات اور روحانیت، اقتدار سے محروم ہوں تو کسی تہذیب کو نہ تو استوار کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تبلیغ و حفاظت، اقتدار اور قوت کو ''انسان کامل'' ''خلافت'' اور ''اقتدار اعلیٰ'' کی صورت میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ جو اقبال کے ہاں موجود ہے۔ اقبال کے ہاں اس کا نمائندہ ''شاہین'' ہے۔ یہ قوت اگر ختم ہو جائے تو آپ کی تمام روحانی و علمی و سماجی جہتیں اور کاوشیں اور ان کی صورت گری اور ان کی تشریحات سطحی اور بے معنی ہوں گی۔ اس وقت مغرب ساری دنیا پر اپنے خیالات و نظریات اور تہذیب کو مسلط کر رہا ہے۔ لیکن یہ تسلط کا عمل جبری نہیں۔ وہ کسی سے نہیں کہہ رہا ہے کہ میرے رنگ میں رنگ جایئے۔ ساری دُنیا خود اس کو اپنے اوپر مسلط کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی اور ایسا ضروری اس لیے ہے کہ ان کی قوت منتشر ہو چکی ہے۔

ہم خیر امت ہیں۔ لیکن ہم اپنے وجود، اپنے نظریات اور اپنی تہذیب سے انحراف کر رہے ہیں اور یہ انحراف ہماری تمام اساس سے انحراف ہے۔ ہماری 'انا' شکستہ ہو چکی ہے۔ ہم حکمت کے وارث تھے، اور حکمت، تزکیہ، تعلیم کتاب اور آیات کی فہم اور ان کے عملی اطلاق کا نام ہے۔ علم سے بڑی کوئی قوت نہیں اور اس کا حصول مسلمانوں پر فرض ہے۔ اللہ پر ایمان کے معنی اس کی کامل وحدت اور اس کے علم کل اور محیط کل ہونے پر ایمان ہے۔ اللہ کے 'علم کل' ہونے سے انکار کے معنی خود بخود اس کی قدرت کاملہ اور اختیار مطلق کا انکار ہے کیونکہ وہ ذات قادر مطلق ہو ہی نہیں سکتی جو علم کل کی مالک نہ ہو۔

اگر وہ علم سے محروم ہے اور قدرت مطلق کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ فریب اور جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک تہذیب کا مرکز یا اس کی روح علم اور اقتدار ہے۔ اس حقیقت کا بہت گہرا احساس اقبال کو تھا۔ اسی لیے وہ 'قوت'، 'شاہین' اور 'خودی' کے شاعر ہیں۔ اور خودی قوت کے بغیر ایک بے معنی مفروضہ ہے۔

تہذیبیں تب تک زندہ رہتی ہیں جب تک وہ اقتدار و قوت سے مزین ہوتی ہیں۔ اور ایک زندہ اور حرکی اور قوی تہذیب ہی علم، فلسفہ، قانون، اخلاق، فن اور سائنس کی خالق ہوتی ہے۔ جب تک یونانی تہذیب قوی رہی اس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو کو پیدا کیا اور نو افلاطونیت کی تخلیق کی، سائنس، منطق، ریاضی کے ساتھ ساتھ عظیم فن پارے تخلیق کئے اور یہ شخصیات اور ان کے نظریات و تعلیمات اتنے وسیع اور متنوع تھے کہ انہوں نے نشأۃ ثانیہ کے بعد پوری دنیا کو زیر نگین کر لیا۔

دوسری مشرکانہ تہذیبیں ایسا نہیں کر پائیں، کیونکہ نہ تو ان میں اتنی قوت تھی اور نہ اخلاقی طور پر اتنی بلند کہ وہ دنیا کو اپنی گرفت میں کرلیتیں۔ حقائق دنیا کو بدل دیتے ہیں۔ جھوٹی کہانیاں اور پدرم سلطان بود کے جھوٹے دعوے نہیں۔

انسانی وجود، انسانی سماج اور تہذیب کا اصل مرکز 'ماں باپ' کا وجود ہے۔ دین حق نے اللہ کی توحید کے بعد جس اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دی وہ 'والدین' کا وجود ہے۔ معراج کے موقع پر جب اللہ نے اسلامی تہذیب اور دین اور اسلامی ریاست کے بنیادی اُصول اپنے نبیؐ کو عطا فرمائے تو اس میں توحید کے بعد 'ماں باپ' کے وجود اور احسانات کا ہی ذکر ہے۔

اقبال کو عورت کی عظمت کا قوی احساس تھا۔ اپنی پوری شاعری میں وہ اس کی تخلیقی و تعمیری اور روحانی و انسانی عظمت وقوت کے گیت گاتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم استناد کے بغیر باتیں کرتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر بات کی جائے تو مطلوبہ استناد کو سامنے رکھا جائے۔

جی۔ ای۔ مور اس صدی کے ایک بہت بڑے فلسفی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہوتے ہیں اور ان میں کچھ سوالات یا تو بے معنی ہوتے ہیں یا وہ سوالات ہی نہیں ہوتے۔ جیسے کہ یہ سوال کہ کیا خدا اپنا جیسا خدا پیدا کرسکتا ہے؟ یہ سوال پوچھنے سے پہلے ہم یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ خدا کے معنی ہی ایسے وجود مطلق کے ہیں جسے کسی نے تخلیق ہی نہ کیا ہو۔ ہم نے سوال ہی بے معنی اُٹھایا۔ وہ خدا ہی کہاں ہوا جسے تخلیق کیا گیا ہو۔ یہ تو ایک کھلا منطقی تضاد اور تناقض ہے۔ منطقی اصولوں کے مطابق بات کیجیے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خدا کا غیر مخلوق ہونا ضروری ہے۔ خدا تو ایک مطلق لامتناہی وجود ہے۔ تو اسے کسی بھی حیثیت سے کیسے محدود کیا جاسکتا ہے، تحدید تو اس لامتناہیت کی ضِد ہے۔ اس کا مطلق طور پر واحد وصمد ہونا لازم ہے۔ کیونکہ لامتناہیت کا کوئی شریک ہو ہی نہیں سکتا اور اگر اس میں شرکت ہو تو اس کی ضروری شرط اور صفت ہی معدوم ہوجائے گی۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کا بار بار اور واضح بیان ہوا ہے کہ خدا تمام کوائف و تعلقات سے بلند ہے۔ وہ یکتا و تنہا اور بے مثل ہے۔ اس کا نہ کوئی رشتہ ہے نہ اس کی کوئی جنس، نہ اولاد، نہ بیوی، کیونکہ اگر خدا پر یہ چیزیں تھوپ دی جائیں جیسا کہ مشرک کرتے ہیں تو پھر وہ خدا ہی کہاں رہا، وہ تو ایک کمزور و مجبور آدمی جیسا

ہوجائے گا، اگر ہم یہ مان لیں کہ اس کی بیوی یا اولاد ہے، تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نامکمل اور محتاج ہے اور ان تمام نفسیاتی، جنسی اور سماجی ضروریات، لوازمات اور تعلقات کا غلام اور پابند ہے۔ جو ایک انسان یا مخلوق سے وابستہ ہیں اور پھر ایک سوال پیدا ہوگا کہ اسے اور اس کی بیوی کو کس نے پیدا کیا۔ کیونکہ بیوی تو اولاد ہوتی ہے کسی دوسرے جوڑے کی۔ اسلام جھوٹی کہانیوں یا کسی اسطور کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اس سے بڑا فریب اور جھوٹ کچھ نہیں۔ یہ شیطان کی گڑھی ہوئی کہانیاں ہیں یا شاعرانہ ہرزہ سرائیاں، ان کا حقیقت مطلقہ یا خدا سے کیا تعلق جس کے وجود کا کسی طور ادراک ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام کا پورا فکری و عملی ڈھانچہ structure حقائق اور منطقی بنیادوں پر استوار ہے لیکن یہ خیال رہے کہ خدا تمام کوائف سے بالا ہے اور اس پر کسی منطق کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ منطق تمام علوم کی طرح اسی کی تخلیق یا عنایت ہے۔

اقبال کے فلسفہ کی گہرائیوں میں اُتریں گے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ انسان کی حیثیت یا حقیقت اصلی کیا ہے؟ یعنی خودی کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جو اقبال کے پورے فکری نظام کا مرکز ہے۔ اس کا پورا فلسفہ اسی قطب پر گردش کرتا ہے۔

خود اقبال کے اپنے الفاظ میں یہ وہ بحر بے کنار ہے جس میں 'خدائی گم' ہے، اسی کی تعمیر میں خدائی ہے، یہ علم سے محکم ہو تو غیرت جبریل ہے اور عشق سے محکم ہو تو صور اسرافیل ہے، اس کی جلوتوں میں مصطفائی اور خلوتوں میں کبریائی ہے۔ اس کی زد میں ساری خدائی ہے۔ اس کا رمز پنہانی کلیمی ہے اور اس کی نگہبانی غریبی میں ہوتی ہے، اسی کے ساز میں عمر جاوداں کا سراغ اور اسی کے سوز سے امتوں کے چراغ روشن ہیں۔ یہ راز درون حیات ہے اور یہی بیداریٔ کائنات ہے، یہ جلوہ بدمست اور خلوت پسند ہے، یہ ایک بوند پانی میں سمندر بند ہے، یہ ازل و ابد سے بالا ہے، یہ تلوار کی دھار ہے، یہ اندھیرے اجالے میں تابناک اور من و تو سے پاک ہے، سفر یعنی حرکت اس کی تقویم کا راز ہے، یہ شیر مولا ہے اور سارا جہاں اس کی گرفت میں ہے۔ یہ جوش کردار ہے اور سیل ہمہ گیر بھی یہ تکبیر مردان خداوند ہے۔ یہ ندرت فکر و عمل ہے اور اسی سے معجزات زندگی ظہور پذیر ہوتے ہیں، یہ نغمۂ شوق بھی ہے اور عشق بھی۔ یہ فقر ہے جو تمام انقلابات کو پیدا کرتا ہے، یہ شبیری بھی ہے اور سرمایۂ شبیری بھی، یہ معرکۂ ابدی ہے یہ ردائے نور ہے، یہ ناصبور ہے، یہ قلزم خاموش ہے، یہ اضطراب ہے، ہمہ وقت اضطراب، اگر یہ زندہ ہے تو موت اک مقام حیات ہے، اس کے لیے تمام کائنات لات و منات کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ یہ

خودنمائی ہے۔ یہ تیغ فساں ہے اور اس کا سرنہاں لا الہ الا اللہ ہے یہ قلندری وشہنشاہی ہے۔ سلطنت فقرو دین اسی کے معجزات ہیں۔ یہ قطرہ نیساں ہے۔ یہ قاہر ہے۔ یہ مکمل آزادی اور حرکت عمل ہے اور وجود اسی کی نمود کا نام ہے۔ یہ شور نشور ہے، یہ جنون ہے، یہ عشق غیور ہے۔ یہ وہ نگاہ شوق ہے جس میں قاہری و جباری اور دلبری ورعنائی سمائے ہوئے ہیں۔ یہ ذوق عمل ہے جس سے امتوں کے نظام مرتب ہوتے ہیں اور اسی کی پرورش ولذت ونمود میں امتوں کی نجات ہے اور یہی صہبائے مسلمانی ہے۔

اقبالؔ کے فلسفہ میں وجود انسانی کی اساسی اہمیت ہے، وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ ساری تخلیق اسی سے معنی پاتی ہے۔ تخلیق کائنات کا مرکز انسانی وجود یا خودی ہے، اگر انسان کو کائنات سے الگ کردیا جائے تو وہ بے معنی ہوجائے گی۔ اگر اس کائنات سے انسان کو الگ کردیا جائے تو یہ کائنات بے معنی ہوجائے گی۔ خدا تمام کائنات سے بالا ہے۔ اسے کسی کائنات کی ضرورت نہیں۔ لیکن انسان کو اس کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ خلیفہ ہے خدا نہیں۔ اسے اپنے وجود کی معنویت یعنی عمل کے لیے ایک کائنات کی ضرورت ہے۔ یہ کائنات اس کا میدان عمل ہے۔ اقبال کا تصور خلافت اسی خلافت ارضی کی تصویر کشی ہے جس کا قرآن حکیم میں بیان ہوا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اسی منصوبہ پر غور کرنا پڑے گا جس کے تحت اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اپنا خلیفہ بنایا اور اس کی خلافت وتخلیق کا مقصد اپنی عبادت بتایا اور عبادت اس کے سوا کیا ہے کہ اللہ کے ہر حکم کو بے چوں وچرا مانا جائے، اور اس نے انسان کو جو قوتیں دی ہیں وہ ان کا عادلانہ اور تخلیقی وفلاحی استعمال کرے اور اس کائنات کی تسخیر کرے اور اللہ کی صفات کو سمجھ لے اور ان کا بیان کرے۔ ''وعلم آدم الاسماء''، تسخیر کائنات اور سجدۂ آدم اور ابلیس کا اس سے انکار، ان سب کو اسی تخلیقی قوت اور خلافت ارضی کے ذیل میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شیطان نے آدم کے سامنے سجدے سے انکار کیوں کیا۔ میں ان آیات بینات پر کبھی کبھی غور کرتا ہوں تو میرے دل میں ہزاروں معانی روشن ہوجاتے ہیں۔ ایک تو یہ آدم خلافت الٰہی کا حامل ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ تمام کائنات کا مرکز بنا علم کی وجہ سے، تیسرے یہ کہ اس کے ماتھے یعنی وجود میں وہ نور قرار پایا، جسے نور محمدی یا عقل اول یا سرا کبر کہا جاتا ہے۔ شیطان ان تینوں وجوہ سے منکر حکم خدا ہوا اور اس انکار کے رگ وپے میں اس کی جھوٹی بڑائی کا گمان یعنی تکبر سرایت کئے ہوئے تھا۔ اور تکبر خدا کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتا۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ‏ ‏ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

مٹی اصل کائنات ہے لیکن مٹی کیا ہے، یہ ایک سربستہ راز ہے۔نور محمدی تمام شرک کو توڑنے والا مرکز روحانی ہے اور شرک کی بنیاد تکبر یعنی خدا کے حکم کا انکار اور اس کے خلیفہ کی برتری سے انکار ہے، اور ہر وہ انسان جس میں تکبر آ گیا، خدا سے منکر، اس کا باغی اور اس کے خلیفہ کی عظمت سے منکر ہے اور ان کے مقابل منفی و طاغوتی قوت ہے۔آدم تمام توحید کا مرکز ہے اور اس مرکز کی اصل رسول اعظم و خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے جو انسان کامل اور سرا کبر کی صورت میں جلوہ گر ہے۔اصل میں اس تمام معرکۂ خیر و شر کو سمجھنے کے لیے منصب رسالت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔رسالت بنیادی طور پر اللہ کی نمائندگی ہے۔رسالت کے ساتھ کئی اصول اور صفات وابستہ ہیں اور ان میں یہ صفت سب سے اہم ہے یعنی پیغمبرؐ کا ہمہ وقت خدا کی نگرانی میں ہونا ''وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى '' اسی حقیقت کا اظہار ہے اور اقبال نے ''عشق تمام مصطفیٰ'' کہہ کر اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔اس بات پر غور کیجئے کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمہ وقت خدا کی نگرانی میں ہیں اور جب کوئی انسان اس عظیم پیغمبرؐ کی غلامی میں ہوگا تو وہ بھی بلاواسطہ خدا کی ہی نگرانی میں رہے گا، کیونکہ غلامی عشق اور غیر مشروط خودسپردگی اور اطاعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان غلاموں کی زندگی میں اسی پیغمبرؐ اعظم کی سیرت کا پرتو نظر آئے گا، اپنی استعداد، اور اپنی خودسپردگی کی سطح کے مطابق۔ان کی زندگی نور سے درخشاں نظر آئے گی اور اگر کہیں کسی گناہ کا شائبہ ملتا ہے تو بہت ہی موہوم Minor اور اس موہوم کو مٹانے والی توبہ اور صبر اور شکر اور حمد باری اور نعت ختم مرتبتؐ ہر نکتہ پر جلوہ گر نظر آئیں گے۔اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ معصوم ہیں، ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ معصوم تو ذات پیغمبرؐ کے سوا کوئی نہیں۔ان کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے ہونے پر افسوس کرتے ہیں۔یہ افسوس کا عمل اپنی ذات اور گناہ گار ہونے کا احساس ہے اور جس دن اور جس لمحہ یہ احساس مرجاتا ہے، انسان مرجاتا ہے۔موت سے انسان نہیں مرتا۔''وہ تو زندہ ہیں جس کا تمہیں شعور نہیں۔'' قبر، دنیا اور زندگی کیا ہے، غور کریں تو اس حوالے سے ان کا استنادی ڈھانچہ Refrential Framework بدل جائے گا اور ایسا تو زمان و مکان کی اور سطح زندگی کی ہر صورت کے ساتھ ہے۔اسے سمجھنے کے لیے آپ کو باقلانی کی طرف جانا پڑے گا۔اقبال کا نظریہ زمان و مکان اور اس کی تفسیر اور تناظرات شاید اسی سے یا تو متاثر ہیں یا اسی سے مستعار ہیں۔لیکن دونوں کا مرکز فکری کلام الٰہی اور فرمان رسول مکرم و معظم ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیب کے درخشاں آفتابوں سے انکار کر رہے ہیں۔ہم باقلانی سے

انکار کر رہے ہیں۔ہم اشاعرہ کے منکر ہیں، ہم ماتریدی کو نہیں سمجھتے، ہم معتزلہ کے روح تجسس و اضطراب سے دور جا پڑے ہیں۔ہم غزالی کی تصنیفات سے خوفزدہ ہیں، ہم شیخ الطائفہ سے واقف نہیں اور اس کے باوجود یا تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب متروک و مفلس ہے یا یہ کہ ہماری تہذیب بڑی ہے۔ہر دو صورت ہمارا دعویٰ یا تو محض جھوٹ ہے یا فریب۔

وہ تو زندہ قوتیں تھیں،نظریہ ساز و آدم گر شخصیات تھیں،اسطوری کہانیاں نہیں تھیں۔اگر جبریہ نہ ہوتے تو قدریہ کیسے وجود پاتے۔اگر قدر کا فلسفہ نہ ہوتا تو معتزلہ کیسے پیدا ہو جاتے اور اگر معتزلہ نہ ہوتے تو فلاسفہ اور اشاعرہ کہاں سے پیدا ہو جاتے اور اگر حضرت امام حسن البصری نہ ہوتے تو فریب جبریہ اور بنوامیہ کے پورے ظلم و جبر کی داستان کون بیان کرتا۔معتزلہ کو اعتزال کا نام کون دیتا،تصوف کے اساسی تصورات خصوصاً تصور خوف کو کون سامنے لاتا اور تصوف کا تصوراتی ڈھانچہ Conceptual Framework کون تشکیل دے دیتا۔

یہ تو فکری مجادلہ آرائی اور ارتقا کی ایک طویل و مربوط داستان ہے۔یہ ایک زندہ داستان ہے شخصیات و نظریات اور ان کی تعلیمات و اعمال کی۔

جنگ اصل میں اذہان کی ہوتی ہے۔تلواروں سے جنگ تو اس کا ایک بہت ہی معمولی پہلو ہے۔یہ تصورات ہوتے ہیں،جن کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔توحید یا شرک ہمیشہ تلوار لے کے نہیں آتے۔ان دو متحارب قوتوں کی اپنی داستان ہے۔

آخر میں بات قرآن حکیم یا کلام الٰہی کے علمی یا علمیاتی اسٹرکچر کی جو بہت ہی وسیع ہے۔یہ عظیم اسٹرکچر پہلی کتابوں میں بھی نہیں ہے اور جدید فلسفہ کے پاس بھی نہیں ہے۔کلام پاک کی زبان اور اس کے بیانات اتنے سہل اور مجمل ہیں جو خود اس کے وحی الٰہی ہونے پر دلیل ہیں۔یہ بیانات ہر زمان و مکان کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور لازمانی کی ایک حقیقت اولیٰ کو سامنے لاتے ہیں۔الفاظ کا ایسا استعمال اور ان کی ایسی ترتیب ہے کہ معانی کے دریا موجزن ہیں اور انسان عاجز ہونے کے باوجود اسی سے مستفید ہو رہے ہیں کتنے ہی ایسے حقائق اور اسرار و رموز ہیں جو زمانے کی رو کے ساتھ سامنے آتے جائیں گے۔قرآنی علمیات چار بڑے ذرائع علم حواس خمسہ،عقل،وجدان اور وحی کو سامنے لاتی ہے۔ان میں حواس خمسہ کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔کبھی یہ کہا گیا کہ تم دیکھتے کیوں نہیں،کیوں سنتے نہیں،

کیوں محسوس نہیں کرتے، کیوں عقل سے کام نہیں لیتے، کیوں نہیں سوچتے، کیوں اندھے، بہرے بنے ہوئے ہو، تعقل، تفکر، تدبر اور شعور پر بہت زیادہ زور ملتا ہے۔ انسانی اعمال اور رحمت و غضب خداوندی کے پس منظر میں مابعدالتاریخ کا بیان ہے لیکن کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارے حواس کی کوئی اہمیت نہیں یا ان کا اعتبار ہی نہیں۔ اگر ان کو غیر معتبر مانا جائے تو عقل کا کیا مطلب و معیار و استعمال ہے کیونکہ عقل کا وجود ہی حواس خمسہ پر ہے اور اگر عقل نہیں تو وجدان ہو ہی نہیں سکتا اور اگر حواس خمسہ، عقل اور وجدان نہیں تو وحی کو کیسے سمجھا ئے یہ سب ذرائع ایک دوسرے سے مربوط ہیں، لیکن ہر ایک کی اپنی حد اور اپنا دائرہ کار ہے۔ وحی ان سب سے بالا ہے، ذریعہ علم ہونے کے باوجود اس کا منبع انسانی وجود نہیں بلکہ خدائے کریم کی ذات ہے۔ لیکن اس کی قوت انسان میں موجود ہے۔ کیونکہ اگر انسان میں کسی شئے کی مطلوبہ قوت و قدرت ہی نہیں تو وہ اس کا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک Bad Conducter میں برقی رو گزر نہیں سکتی۔

اقبال اس عظیم کتاب قرآن حکیم کے ہر لمحہ دل پر نزول کے خواہش مند ہیں، تا کہ انسان کی حقیقت تک رسائی ہو سکے۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

کلام پاک اپنے آپ کو اس شخص پر Reveal کھول دیتا ہے، جو اس میں گم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ اس کی روح اور معانی میں جتنا داخل ہونے کی کوشش کریں گے، جتنا اس میں الجھ جائیں گے یا الجھتے جائیں گے، یہ آپ پر حقائق کا انکشاف کرے گا۔

ہم جسے اقبال کہہ رہے ہیں یا سمجھ رہے ہیں وہ اقبال ہے ہی نہیں۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ تیسرا بڑا آدمی، وہ عظیم خود آگاہ اور حقیقت گاہ روح ہے جو مظلوم ہے۔ میں ابن عربی اور غزالی کی بات کرتے کرتے رک گیا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اقبال کا نام نہیں لیا۔ وہ ان دو مظلوموں کے ساتھ تیسرا مظلوم ہے۔ اس کا کینوس حبہ خاتون اور کولرج سے بہت بڑا ہے۔ اس کے الفاظ کی روح میں اس کے عروج و زوال کی پوری داستان ایک المیہ کی صورت میں منعکس ہو رہی ہے۔ وہ ایک پیغام کا حامل ہے اور اس پیغام کے سوتے اس چشمہ مصفا سے پھوٹ رہے ہیں، جسے توحید کہتے ہیں اور اس کی ساری کائنات وہ عظیم وجود ہے، جسے قرآن رحمت اللعالمین کے نام سے یاد کر رہا ہے۔ وہ روح

قرآن کی وجدآفرین لہروں میں حیات جاودانی کو تلاش کررہا ہے۔وہ مشرق اور مغرب کی لادین اور غیر انسانی تہذیبی یلغار اور فلسفوں سے بھی واقف ہے اور ان کی تمام شیطانی چالوں سے بخوبی آگاہ ہے اور ملت مرحومہ کی خودفراموشی جو غلامی کی ذلت اور اپنے وجود کی عظمت اور ذمہ داری کے احساس سے محرومی کا نتیجہ ہے سے بھی آگاہ ہے۔

آج خواتین کو بااختیار بنانے کا ایک ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔اور یہ کھیل انسانیت دشمن اور عورت دشمن شیطانی تہذیبوں اور فلسفوں کا بہت پرانا کھیل ہے۔جن تہذیبوں نے عورت کو مجسم لعنت کہا اور جنہوں نے اسے زندہ دفن کیا،اور جنہوں نے اسے تمام حقوق انسانی،حقوق ملکیت واختیارات سے محروم کیا۔اسلام نے اسے ایک محترم ومکرم وجود کا درجہ دیا اس کو تمام مالکانہ حقوق دیے۔اس کی گود کو تہذیب وتمدن کا گہوارا قرار دیا اور اسے باوقار زندگی گزارنے کا حق دیا۔دیوی کے بجائے اسے انسان کا مرتبہ دیا۔

اقبال نے اس کے وجود کو تصویر کائنات کا رنگ قرار دیا۔اس نے اسرار خودی میں حضرت بتولؑ کی مدحت میں اس کی شناخت کی نشاندہی کی۔اس نے کہا کہ حضرت مریمؑ کی ایک شناخت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی والدہ گرامی قدر ہیں لیکن جناب فاطمہ الزہراؑ کی تین شناختیں ہیں: وہ سیدالانبیاءؐ کی دختر ہیں،آپؐ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں اور شیر خدا علی مرتضیٰؑ کی شریک حیات ہیں اور امام المتقین اور سیدالشہدا کی والدۂ محترمہ ہیں۔اور اس طرح وہ اس تہذیب کی ضامن،اس کی شناخت،اس کی تہذیب اور اس کی حفاظت کا مرکز ہیں۔

خاتمہ بحث یہی ہے کہ فکر اقبال کو اور اس کی معنویت کو جدید فلسفیانہ تناظر،سماجی وسیاسی تغیرات اور روحانی ووجودی کشمکش اور تلاش ذات کے کرب کے پیچیدہ دائروں میں سمجھنے کے لیے اس کے پورے فلسفیانہ اسٹرکچر کو سمجھنا ضروری ہے۔جدید سائنسیت کی سمجھ،تہذیبوں کی کشمکش اور روحانی انتشار اور مغرب کے عظیم اذہان جیسے،مارکس،درکھیم،فرائڈ،دریدا،اور چومسکی کے تصورات کی کنہ تک پہنچنے کے لیے ان کا گہرا فہم ضروری ہے۔

☆ یہ مضمون دراصل اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی میں دیا گیا خطبہ ہے جس کو جناب مدثر الماجدی نے مرتب کیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور قصص القرآن

☆کلیم صفات اصلاحی

حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی شخصیت یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم سے عبارت تھی۔ وہ گذشتہ صدی کے ہندوستان کے ممتاز ترین علما کی صف میں بھی نمایاں شان کے حامل تھے، جمعیۃ العلما کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا، ملکی مسائل پر ان کے نقطہ نظر نے ان کو ہر طبقہ میں محبوب و مقبول بنایا، ان کی جماعتی و سیاسی سرگرمیوں کے شور میں ان کی علمی منزلت کی جانب توجہ کم کی گئی جب کہ ان کی سب سے مشہور تالیف قصص القرآن ہی ان کی علمی و تحقیقی مقام کے تعین میں کافی ہے، چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب سے ان کی قرآنی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی کتاب کی روشنی میں ان کی اسی قرآنی بصیرت کا جائزہ مقصود ہے۔

مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز اور مدت: مولانا قاضی سجاد حسین میرٹھی نے مولانا سیوہاروی کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی کل مدت دس سال قرار دی ہے، جس کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنّفین کی تاسیس سے ہوا۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا سیوہاروی کی تصنیفی و تالیفی زندگی نے صرف دس سال کی مختصر مدت پائی۔ ۱۹۳۸ء (ندوۃ المصنّفین کا سالِ تاسیس) سے یہ دور شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک انقلاب پر ختم ہو گیا۔ اسی مختصر مدت میں عظیم الشان تصنیفی کارنامے آپ (انہوں نے) انجام دیے، جن کو ہندوستان کے صف اول کے ادبا و مصنّفین کی بہترین علمی خدمات کے مقابلہ پر بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے''۔(۱)

☆ رفیق دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

لیکن مولانا محمد منظور نعمانی نے ان کی پہلی کتاب ''بلاغ مبین'' کو قرار دیا ہے جو ۱۹۳۵ء میں تصنیف کی گئی تھی، لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے یاد ہے کہ انہوں نے سب سے پہلی کتاب ''بلاغ مبین'' لکھی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دعوتی مکاتیب کو جمع کیا تھا جو آپؐ نے اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے فرماں رواؤں کو بھیجے تھے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق تاریخی بحث بھی کی تھی، یہ کتاب مولانا نے غالباً ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی، اس کے بعد قومی وملی خدمات کے ساتھ ساتھ (جس کے سلسلہ میں بار بار جیل بھی جانا پڑا) ۱۹۴۷ء تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔(۲)

اس اعتبار سے ان کی تصنیفی زندگی کی کل مدت تقریباً ۱۳؍سال قرار پاتی ہے۔

قصص القرآن کا سبب وسال تصنیف: قرآن مجید میں اقوام وملل کے عروج وزوال کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کا مقصد وحید تذکیر وعبرت پذیری ہے۔ مولانا نے اسی احساس کے تحت عبرت پذیری کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیشتر گزشتہ اقوام اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض واقعات بھی اس ضمن میں آ گئے ہیں اور یہ تمام تر حق و باطل کے مجادلوں اور اولیاء اللہ و اولیاء الشیاطین کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جو خدائے تعالیٰ کے اس مکمل ترین اور آخری قانون (قرآن عزیز) سے استفادہ کرتے اور اپنے مردہ دلوں میں ایمان ویقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں............اس چودھویں (اب پندرھویں) صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو دعوائے اسلام اور قرآن کو خدا کا کلام یقین کرنے کے باوجود کتنے ہیں جو اس کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لیے بہترین نظام عمل بناتے اور اس نظر سے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔

اپنی اور اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جی چاہا کہ اس سرمایۂ عبرت و

بصیرت کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نقل سے محفوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو اور اس طرح سعادتِ دارین کا سراغ ملے''۔(۳)

قصص القرآن کی کل چار جلدیں منظر عام پر آئیں اور ہر جلد کے چھ سے آٹھ ایڈیشن نکلے جو اس کی مقبولیت کی دلیل ہے اور غالباً ترجمہ وتفسیر سے ہٹ کر کسی ایک قرآنی موضوع پر کسی بھی اردو تصنیف کو یہ امتیاز آج تک حاصل نہ ہوسکا کہ اس کی متعدد جلدوں کے اس قدر ایڈیشن شائع ہوئے ہوں۔اس کی پہلی جلد ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء، دوسری ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء، تیسری ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء اور چوتھی ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔(۴)

قصص القرآن کی خصوصیات: یقیناً قصص القرآن مولانا سیوہاروی کی تصنیفات میں سب سے اہم ہے۔مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے بقول اس موضوع پر عربی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن اردو میں قصص الانبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔مولانا نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی،مولانا ندوی نے اس کی خصوصیات کا اجمالاً تذکرہ یوں کیا ہے:

''عربی میں تو اس نقطہ نظر سے ''قصص القرآن'' پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص الانبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور افسانوی کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی ،مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ''قصص القرآن'' لکھی ،اس میں کلام مجید اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جا بجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت وصداقت ثابت کی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیے ہیں اور قرآن مجید کے اصل عبرت وبصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے،اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت وبصیرت کا صحیفہ بھی''۔(۵)

اس کے علاوہ اسلوب بیان کی سادگی، تحقیقی ژرف نگاہی ، اصلاحی اور دعوتی طرز و انداز ، آیات واحادیث اور عربی عبارتوں کے ترجموں کی نہایت آسان تفہیم وغیرہ بھی اس کی خوبیاں ہیں،خود

مصنف نے اس کے درج ذیل خصائص تحریر کیے ہیں جن کا لحاظ انہوں نے تمام جلدوں میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

"اپنی سادہ طرز نگارش کے باوجود اس مجموعہ میں چند خصوصیات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے:

ا۔ کتاب میں واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور واقعات تاریخی سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

۲۔ تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آپڑا ہے تو اس کو روشن دلائل و براہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقت قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔

۳۔ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافات کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ ہر پیغمبر کے حالات قرآن مجید کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔

۶۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج و عبر" یا "عبر و بصائر" کے عنوان سے اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے"۔(۶)

قصص القرآن کی مقبولیت: مصنف نے متعدد طباعتوں کے پیش لفظوں میں اس کتاب کی مقبولیت کا خصوصی ذکر کیا ہے، چنانچہ جلد دوم کے طبع ثانی پر جلد اول کے طبع ثانی کے متعلق پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"جب قصص القرآن جلد اول طبع ہو کر شائع ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ کتاب اس درجہ قبول ہوگی اور اس قدر پسند کی جائے گی، جس کا مشاہدہ عام

پڑھنے والوں کی قدر افزائی کے علاوہ معزز رسائل اور موقر جرائد کے ذریعہ اہل قلم کی آرا اور ان کے تبصروں کی شکل میں ہوا، فالحمد علی ذلك"۔(۷)

جلد دوم کے متعلق دیباچہ طبع دوم میں لکھتے ہیں:

"الحمدللہ کہ قرآن عزیز کی یہ خدمت مقبول خاص و عام ہوئی، پہلے حصہ کی طرح دوسرا حصہ بھی بہت جلد ختم ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اس کی ایک جلد بھی دفتر میں برائے فروخت نہیں تھی"۔(۸)

تیسرے حصہ کے متعلق اس کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

"قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیۂ ناظرین ہے، پہلے اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہار و شکر کے لیے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں"۔(۹)

حصہ چہارم کے متعلق دیباچہ طبع ثانی میں رقم طراز ہیں:

"بلاشبہہ یہ مؤلف کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کتاب بحمداللہ مقبول خاص و عام ہوئی بلکہ یہ تو قرآن حکیم کا اپنا معجزہ ہے کہ ایک سطر یا ایک لفظ بھی اس کی سچی خدمت سے اگر وابستہ ہو جائے تو وہ لفظ اور وہ سطر بھی مخدوم و مقبول بن جاتی ہے"۔(۱۰)

قصص القرآن کے بارے میں بعض علماء کے آراء: جب مولانا سیوہاروی نے اس پر کام شروع کیا تو انھوں نے بعض مفسرین سے اس سلسلہ میں گفتگو کی، بالخصوص مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس سلسلہ میں مولانا سیوہاروی کی گفت و شنید کا ذکر وفیاتی مضمون میں اس انداز سے کیا ہے:

"مرحوم و مغفور سے پہلی ملاقات آج سے تیس بتیس سال قبل دہلی کے سفر میں ہوئی......اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر علمی و دینی رہی، خصوصاً قرآن مجید کی تفسیروں اور ترجموں سے متعلق سنجیدگی فکر اور اپنے کام میں تندہی و انہماک کے آثار اس وقت بھی نمایاں تھے"۔(۱۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا نے اردو میں یہ کتاب تصنیف فرما کر ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی اور

اسلامیات اور علوم قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی ذخیرہ مہیا کر دیا"۔(۱۲)

مولانا قاضی زین العابدین صاحب اس کتاب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کو مصنف کے لیے ذریعۂ نجات قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

"مولانا حفظ الرحمٰن نے اس وادی میں قدم رکھا اور "قصص القرآن" کے نام سے اسے باغ و بہار بنا دیا، انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کی نجات کے لیے ان کی یہ قرآنی خدمت کافی ہے، کتاب بے حد مقبول ہوئی اور مصنف کی آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی مشکور ہوئی"۔(۱۳)

آئندہ سطور میں اس کی ہر جلد کے الگ الگ موضوعات ومباحث کا اجمالی جائزہ تعارف میں پیش کیا جائے گا تاکہ اس کتاب کی اہمیت وافادیت بالخصوص آج کے زمانہ میں اس کی ضرورتِ اشاعت اور قدر و قیمت کو بہ آسانی سمجھا جا سکے۔

جلد اول کے موضوعات ومباحث: اس حصہ میں مولانا نے حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک کل ۱۴/انبیاء حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت لوط، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ وہارون علیہم السلام کے سوانح اور ان کے مستند ترین واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔

تخلیق آدم کے متعلق یہ مسئلہ علمائے یہود ونصاریٰ اور بعض علمائے اسلام کے درمیان موضوع بحث رہا ہے کہ انسان اول کی پیدائش کائنات کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ ہوئی، علمائے یہود ونصاریٰ اور بعض علمائے اسلام مثلاً علامہ سبکی وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ ان کی پیدائش کائنات کے ساتھ ہوئی، مولانا فرماتے ہیں:

"یہ مسلک درست نہیں ہے، نہ علمی وتاریخی اعتبار سے اور نہ دینی ومذہبی روایات کے لحاظ سے، یہود ونصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں انہوں نے کس بنیاد پر یہ کہا اور ان کے پاس اس کے لیے کیا دلیل ہے؟ مگر علامہ سبکیؒ سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انہوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا"۔(۱۴)

اس کے بعد علامہ سبکیؒ کے مغالطہ کی وجہ صحیح مسلم کی فضائل جمعہ والی حدیث کو قرار دیا ہے جس

میں ہے کہ آدمؑ کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی، ان کے مطابق قرآن نے خلق کائنات کا جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں خلق آدم کا ذکر نہیں کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم کی تخلیق کائنات کی تخلیق کے ساتھ وابستہ نہیں ہے''۔(۱۵)

قصۂ آدم سے جو چند اہم عبارتیں لکھی ہیں اس کی تلخیص پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کی حکمتوں کے راز بے شمار ہیں، ان سے کسی بھی مخلوق خواہ وہ فرشتہ ہو یا جن وانس، مکمل واقفیت ناممکن ہے، اللہ کی عنایت سے حقیر شے بھی منصب جلیل پر فائز ہوسکتی ہے، ہر طرح کی بزرگی وجلالت کے باوجود خلقی اور طبعی کمزوری اور بشریت کا نقص باقی ہے، غلطی کے بعد انسانوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بارگاہِ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی کو بھی تباہ وبرباد کردیتی ہے۔(۱٦)

حضرت نوحؑ کے متعلق کئی امور پر گفتگو کی ہے، اس قصہ سے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں کہ بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا علاج نہیں ہوسکتی، بری صحبت زہر ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے، توکل علی اللہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ صحیح طریقہ کار ہے، انبیاء سے بھی بہ تقاضائے بشریت غلطی ہوسکتی ہے، ظلم، غرور اور بدعملیوں کی سزا کے لیے عالم آخرت مخصوص ہے تاہم دنیا میں بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی سزا ضرور مل سکتی ہے۔(۱۷)

حضرت ادریسؑ کے متعلق کتابوں میں ہے کہ عبادت کے لیے ہیکل کی تعمیر، علم طب کی ایجاد، طوفان کی آمد کی اطلاع، مصر میں اہرام اور برابی کی تعمیر اور تمام صنائع اور نو ایجاد آلات کی تصاویر اور حرکات نجوم وغیرہ کا ذکر سب سے پہلے ان ہی کی زبان پر آیا، مولانا محاکمہ میں فرماتے ہیں کہ یہ افسانے ہیں جو حضرت ادریسؑ پر چسپاں کیے گئے ہیں جس کی تائید عقل ونقل دونوں سے نہیں ہوتی بلکہ تحقیق اور صحیح علم تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات آج اس طرح ظاہر کررہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مرادف ہے، اس سلسلہ میں بس اسی قدر سچ ہے جس کا ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہے۔(۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر اور تارح کے سلسلہ میں توریت، مؤرخین اور مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، قرآن نے آزر نام کو ترجیح دی ہے، مولانا نے اس مسئلہ میں عالمانہ بحث کی اور لکھا:

''اصل بات یہ ہے کہ ''آدار'' کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور

عربی میں یہی آزر کہلایا، تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا، اس لیے آزر ہی کے نام سے مشہور ہوگیا، حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جب کہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا‘‘۔(۱۹)

حضرت ابراہیمؑ کے شجرۂ نسب اور ان کی شخصیت پر مستشرقین کی جانب سے قرآن مجید کے بیانات پر کیے جانے والے لغو اور بے بنیاد اعتراضات کا محاکمہ کرکے ان کی ہرزہ سرائیوں کو بے نقاب کیا ہے، یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔(۲۰) اسی طرح آگ کے سرد ہوجانے کی توجیہ مذہب کے ساتھ سائنٹفک دلائل کے ذریعہ مولانا نے یہ پیش کی ہے کہ اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جاسکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لیے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو ابراہیم تک نہ پہنچادے اور اس طرح آگ کو بحق ابراہیم (علیہ السلام) بردوسلام نہ بنادے۔(۲۱)

حضرت اسماعیلؑ کے تذکرہ میں ان کی ولادت، بے آب وگیاہ صحرا میں ان کے چھوڑنے، مکہ میں بحالت شیرگی یا سن رشد کی عمر کو پہنچ کر داخل ہونے کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق سے اختلاف اور بحالت شیرگی پہنچنے کی روایت سے اتفاق، ختنہ، ذبح عظیم، بناء کعبہ، اولاد اسماعیل، وفات اسماعیلؑ، قرآن میں ذکر اسماعیلؑ، بشارت اسحاقؑ، اولاد اسحاقؑ، حضرت ابراہیمؑ کی قطورہ سے شادی اور ان سے چھ اولادوں کے متعلق واقعات زیر تحقیق آئے ہیں اور اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کو حضرت ابراہیم کی نسل سے بتا کر لکھا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی بعثت انہی دونوں قوموں میں ہوئی تھی، دلیل دی کہ حافظ ابن کثیر اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کو ایک ہی مانتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے۔(۲۲)

حضرت لوطؑ کے تذکرہ میں مختلف عنوانوں کے تحت بحث کی ہے، بالخصوص حضرت لوطؑ کی زبانی قرآن کے اس جملہ ’’هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ، هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ‘‘ پر معرکہ آرا تحقیق پیش کی ہے اور اس ضمن میں امام رازی، اصفہانی، ابوالسعود، عبدالوہاب نجار مصری کی توجیہات کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس کا مقصد ان شریروں اور بدبختوں کو عار وشرم دلانا اور اس قبیح فعل پر ان کو ذلیل ونادم کرنا تھا۔(۲۳)

قصہ یوسف کا ہر پہلو آ گیا ہے۔ وصیت یوسفؑ پر حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں عمل وغیرہ جیسی بحث نے اس کو انفرادی حیثیت دے دی ہے۔ آخر میں قصہ یوسفؑ میں فضائل اخلاق یعنی قوت ایمانی، استقامت، ضبط نفس، صبر، شکر، عفت، دیانت وامانت، عفوودرگزر، جذبہ تبلیغ، اعلاء کلمۃ اللہ سے عشق، اصلاح نفس وتقویٰ وغیرہ صفات کاملہ کو حضرت یوسفؑ کی زندگی کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ مولانا کے بقول ''اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر'' (۲۴) اسی واقعہ میں ''لولا ان راٰ برھان ربی'' میں ''برہان رب'' کی علمائے تفسیر نے متعدد تفسیریں کی ہیں، مثلاً حضرت یعقوبؑ کی صورت نظر آنا اوران کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہوکر ان کو اس سے روکنا یا عزیز مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرت یوسفؑ کا اس سے عبرت لینا، ''برہان رب'' تھا جو حضرت یوسفؑ کو نظر آیا لیکن مولانا نے ''برہان رب'' کی وہ تفسیر قبول کی ہے جو خود قرآن مجید کی نظم وترتیب سے ظاہر ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

> ''اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں ''برہان رب'' کی تفسیر وہی بہترین تفسیر ہے جو خود قرآن عزیز کی نظم وترتیب سے ثابت ہے یعنی: ۱۔ایمان باللہ کا حقیقی تصور ۲۔اورمربی مجازی کی احسان شناسی اور وصف امانت، عزیز مصر نے یوسفؑ کے متعلق اپنی بیوی سے کہا تھا ''اکرمی مثواہ'' اس (یوسف) کو عزت سے رکھنا، یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا ''احسن بی مثوای'' اس (عزیز مصر) نے مجھ کو عزت دی، تب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خیانت کرکے اس کو بے عزت کروں''۔ (۲۵)

حضرت شعیبؑ کے متعلق قرآن میں ذکر، قوم شعیبؑ، مدین واصحاب ایکہ، زمانۂ بعثت، دعوت حق، قوم کی سرکشی، سرکشی کا انجام کے عناوین کے تحت عالمانہ گفتگو کی ہے، حضرت شعیبؑ کے زمانۂ بعثت کے متعلق عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں صبح الاعشیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کی بعثت آحاز کے زمانہ میں ہوئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت شعیبؑ حضرت موسیٰؑ کے تقریباً سات صدی بعد پیدا ہوئے، مولانا کے مطابق ''یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، اس لیے کہ حضرت شعیبؑ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بڑے ہیں اور حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کا

زمانہ پایا ہے یا نہیں، یہ بات البتہ اختلافی ہے"۔(۲۶) مولانا کے مطابق سورۂ اعراف، حج، ہود اور عنکبوت میں حضرت شعیبؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر آیا ہے، قلقشندی نے حضرت شعیبؑ کی جگہ شعیاء نبی کا تذکرہ کر دیا جو عہد آحاز میں مبعوث ہوئے تھے۔(۲۷)

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تذکرہ کے ضمن میں بنی اسرائیل، حضرت موسیٰ، فرعون و ہامان وغیرہ بیانات قرآن کریم کے ہر جزئیہ کو انھوں نے سمیٹ لیا، معجزہ اور سحر کو مولانا نے خاص طور پر اہمیت دی ہے اور چونکہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں "سحر" کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت حاصل تھی اور ساحروں کا رتبہ بہت بڑا سمجھا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس غلط علم کی بے حقیقتی ظاہر کرنے کے مقصد سے حضرت موسیٰ کو اسی نوع کے نشانات یعنی معجزے عطا کیے۔

مولانا نے قرآن، حدیث، فقہ، علمائے تفسیر، مورخین اور سائنس دانوں کے بیانات کی روشنی میں معجزہ اور سحر کے درمیان فرق کی نشاندہی کی ہے، لکھتے ہیں کہ معجزہ دراصل براہ راست خدا کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جاسکے، اور نبی ہر وقت اس کے کر دکھانے پر قادر ہوتا ہے تاوقتیکہ مخالفینِ صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے، سو جب وہ اہم وقت آجاتا ہے اور "نبی" خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کو کر دکھانے کی قوت عطا ہوجاتی ہے، بخلاف سحر اور جادو کے کہ وہ ایک فن ہے کہ جس کو اس کے اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن داں ساحر ہر وقت کام میں لاسکتا ہے، اس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے تمام واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں اسی لیے وہ دوسرے علوم وفنون کی طرح مدون و مرتب فن ہے جس کو مصریوں، چینیوں اور ہندوؤں نے بہت فروغ دیا اور حد کمال کو پہنچایا(۲۸) یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جدا اور متمایز ہوجاتی ہے، رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف و دہشت، ایذا رسانی اور بد عملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اس کے سامنے مرعوب ہوجاتے ہیں، بخلاف نبی اور رسول کے کہ اس کی تمام زندگی صداقت، خلوص، مخلوق خدا کی ہمدردی و غمگساری اور تقویٰ و طہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کیریکٹر بے داغ، صاف اور روشن ہوتا ہے

اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا.......... نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب و عاجز۔ (۲۹)

حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں اہم واقعہ حضرت خضرؑ سے ملاقات ہے، حضرت خضرؑ سے متعلق بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں، محققین کی نگاہ میں وہ سب موضوع، بے اصل اور اسرائیلیات سے ماخوذ اور غیر معتبر ہیں، بالخصوص حضرت خضرؑ کے نام یا لقب یا ان کے نبی، ولی یا رسول، پھر ان کی ابدی حیات کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں ملتی ہیں، مولانا سیوہارویؒ نے ان تمام امور پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ قرآن میں ان کے نام ولقب کی کوئی صراحت نہیں ہے، صرف عبداً من عبادنا لکھا ہے، البتہ حدیث میں خضر نام ملتا ہے، اس سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ حضرت موسیٰؑ کے معاصر تھے، اس کے علاوہ ان کے نام ونسب اور لقب کی تمام بحثیں محض تخمینی اقوال کی اہمیت رکھتی ہیں، دوسری ان کی نبوت وولایت کے متعلق جو بات کہی جاتی ہے کہ وہ ولی تھے یا نبی، تو قرآن کی آیتوں سے ان کا منصب نبوت پر فائز ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کی مزید تائید دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ہوتی ہے، تاہم مجموعۂ کمالات نبوت و رسالت میں حضرت موسیٰؑ کا مقام ان سے بلند ہے، تیسری بات حضرت خضرؑ کی ابدی زندگی سے متعلق ہے یعنی ان کی حیات ابدی ہے یا وہ وفات پاچکے تو اس سلسلہ میں صحیح الرائے علما و محققین اسی بات کے قائل ہیں کہ ان کو حیات ابدی حاصل نہیں اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پاچکے اس لیے کہ قرآن میں صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر کو حیات ابدی عطا نہیں کی، ''وما جعلنا لبشرٍ من قبلك الخلد'' اس کے علاوہ آل عمران، آیت نمبر ۸۱ سے بھی ان کی ابدی حیات کی تردید ثابت ہوتی ہے، مولانا سیوہاروی کے بقول قرآن کی ان آیات کے علاوہ صحیحین کی بعض روایتیں حضرت خضر کی ابدی زندگی کے عقیدہ کی تردید کرتی ہیں، (۳۰) آخر میں خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ اس معاملہ کو قرآن نے جس طرح مجمل رکھا ہے، ہم صرف اسی پر یقین رکھیں اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں، (۳۱) قصۂ موسیٰ کے ضمن میں کل ۲۰ بصائر استخراج کیے ہیں، جن میں بعض اہم بصیرتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

انسان کو مصائب اور ابتلا کے وقت صبر واستقامت سے کام لینا چاہیے، اپنے معاملات میں اللہ پر مکمل اعتماد کرنا چاہیے، حق کے سامنے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت ہیچ ہوجاتی ہے، حق کی

حمایت کے وقت اللہ تعالیٰ دشمنوں میں سے ہی معین و مددگار پیدا کر دیتا ہے، صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے، چاہے اس کو حاصل کرنے میں کتنی ہی تلخیاں برداشت کرنا پڑے، غلامی اور محکومانہ زندگی عزم و ہمت کی روح کو پست کر دیتی ہے، زمین کا وارث وہی ہوتا ہے جو بے سروسامانی میں عزم و ہمت کا ثبوت دے، باطل چاہے کتنا ہی طاقتور ہو، نتیجتاً اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا ہے، اللہ کی سنت ہے کہ وہ ظالم حکمرانوں کو مٹا کر ضعیف اور کمزوروں کو اقتدار بخشتا ہے، طاقت اور حکومت کے نشہ میں مست قوموں کے مقابلہ میں ہمیشہ دعوت حق کے علمبرداروں کو فتح نصیب ہوتی ہے، دین پر ہمیشہ صداقت وسچائی کے ساتھ عمل کرنا چاہیے، خواہش نفس کو امام نہیں بنانا چاہیے، داعی کو ہمیشہ حق کی وصیت کرتے رہنا چاہیے، چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے، کسی قوم پر جابر و ظالم فرمانروا کا مسلط ہونا عنداللہ اس کی مقبولیت کی دلیل نہیں بلکہ عذاب الٰہی ہے، کسی کے لیے بھی خواہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو، یہ دعویٰ درست نہیں کہ وہ کائنات میں سب سے زیادہ جاننے والا ہے، مسلمانوں کے لیے غلامی لعنت ہے، اس پر قناعت کر لینا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔(۳۲)

جلد دوم کے موضوعات ومباحث: اس جلد میں حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک تقریباً ۱۳ نبیوں حزقیل، الیاس، الیسع، شمویل، داؤد، سلیمان، ایوب، ذوالکفل، عزیر، زکریا علیہم السلام کے سوانح حیات، ان کی دعوت حق کا جائزہ لیا ہے، اس کا اسلوب و انداز بھی وہی ہے جو پہلی جلد کا ہے۔

حضرت یوشعؑ حضرت موسیٰؑ کے خادم خاص تھے، ان کی وفات کے بعد جانشین بنے، ان کے ذکر میں پہلے ان کی نیابت و جانشینی، قرآن میں ان کا ذکر، نسب، ارض مقدس میں داخلہ، حق ناسپاسی اور آخر میں حیات یوشع و بنی اسرائیل کے واقعات میں چند بصائر و عبر کے عنوانات کے تحت جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ارض مقدس میں جابر طاقتوں کے استیصال کے لیے بحکم الٰہی حضرت یوشع کو امیر جیش بنایا لیکن روانگی سے قبل حضرت موسیٰؑ کی وفات ہوگئی تو اللہ نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا اور ارض مقدس ان ہی کی امارت میں فتح ہوئی، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ فتح کے بعد اس شہر میں متکبرانہ کے بجائے مشکورانہ و عاجزانہ داخل ہونا، لیکن انہوں نے خلاف ورزی کی اور اکڑ کر سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے داخل ہوئے جس کو قرآن نے رجزاً من السماء سے تعبیر کیا ہے۔(۳۳) مولانا کا خیال ہے کہ ناسپاسی اور نافرمانی کا یہ مذموم فعل بنی اسرائیل کی پوری

جماعت سے سرزد نہیں ہوا تھا، ان میں سے ایک جماعت حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ تھی۔

(۳۴)واقعۂ یوشع میں مولانا نے ۳ عبرتوں یعنی شکر، امید اور ناشکری پر وعید کا ذکر کیا ۔(۳۵)

حضرت حزقیل کا ذکر ان کے نام سے قرآن میں نہیں ہے تاہم سورۂ بقرہ میں موت کے عذاب سے جن لوگوں کو نجات ملی تھی تفسیری بیانات کے مطابق وہ حضرت حزقیلؑ کی دعا کا نتیجہ تھی۔ مولانا تفسیر ابن کثیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ اسرائیلی جماعت داردوان کی رہنے والی تھی جو شہر واسط سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے اور یہ لوگ جہاد سے فرار ہو کر اُفیح کی وادی میں چلے گئے تھے، وہیں ان پر عذاب موت آیا تھا، (۳۶) مولانا نے ان کا تذکرہ بالخصوص احیاء موتی کی بحث دلپذیر انداز میں کی ہے۔(۳۷)

بعض آثار میں الیاسؑ اور ادریسؑ ایک نبی کے دو نام بتائے جاتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں چوں کہ یہ تحقیق قرآن اور محدثین کے بیانات کے خلاف ہے، اس لیے صحیح نہیں ہے۔(۳۸)

حضرت یسعؑ کے متعلق ہے کہ یہ حضرت یوسف بن یعقوب کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت الیاسؑ کے خلیفہ تھے اور ان ہی کے طریقہ پر بنی اسرائیل کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔(۳۹)

حضرت شمویلؑ کا تذکرہ ص ۳۵ تا ۵۴ تک پھیلا ہوا ہے، اس میں پہلے بنی اسرائیل کی گزشتہ تاریخ پر طائرانہ نظر، اس کے بعد نام و نسب، قوم میں دعوت و تبلیغ، قوم کا مطالبہ، ان پر تنقید، بنی اسرائیل کا امیر حکومت، قرآن عزیز اور بنی اسرائیل، طالوت و جالوت، ایک اسرائیلی روایت پر محاکمہ، شجاعت داؤد، جنگ طالوت و جالوت میں بنی اسرائیل کا امتحان، تابوت سکینہ وغیرہ کی بحثیں زیر تحقیق آئی ہیں، حضرت شمویلؑ کے واقعات زندگی میں تابوت سکینہ کی واپسی ایک خدائی معجزہ ہے جو بنی اسرائیل کے مطالبہ کے سبب وجود میں آیا تھا، مگر عبدالوہاب نجار نے لکھا ہے کہ ''تحملہ الملائکۃ'' سے مراد یہ ہے کہ ملائکہ کی رہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی سائق کے منزل مقصود پر لائیں گی، مولانا حفظ الرحمٰن فرماتے ہیں کہ یہ تاویل قرآن اور بائبل کی تطبیق میں اگرچہ خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر یہ نظم قرآنی کے خلاف ہے، تابوت سکینہ کی واپسی خدا کا ایک نشان تھا جو سموئیل کے ہاتھوں پر اس طرح ظاہر کیا کہ ملائکۃ اللہ نے بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے اس کو لا کر طالوت کے سامنے پیش کر دیا، تورات کے بیان سے اس کی حیثیت معجزہ کی ظاہر نہیں ہوئی۔(۴۰)

حضرت داؤدؑ کے بارے میں ان کے نسب نامہ، حلیۂ مبارک، قرآن میں ذکر، نبوت و رسالت

کے منصب پر فائز ہونا، عظمت مملکت، زبور، خصائص داؤد، تسخیر و تسبیح طیور و جبال، لوہے کا نرم ہونا، تفصیل سے ہے۔ قرآنی بیانات کے علاوہ توریت اور اسرائیلی روایات میں ان پر بے سروپا اور رکیک الزامات بھی لگائے گئے ہیں، مولانا نے ان کا محاکمہ کیا ہے اور خود توریت کے بیانات سے ہی مدلل تردید کی اور لکھا کہ ان تمام آیات میں حسب عادت قرآن عزیز نے کتب سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیرووں کی تحریف و تبدیلی کی بدولت ان میں بطور معتقدات داخل ہو گئے ہیں، اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔(۴۱)

حضرت سلیمانؑ کے جہادی گھوڑوں کو ذبح کرنے والی حضرت علیؓ سے منسوب روایت کو مولانا نے صحیح نہیں مانا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کی جانب ایسے عمل کی نسبت عقلاً نامناسب ہے۔(۴۲) اسی طرح کرسیِ سلیمان پر القاء جسد کے سلسلہ کی روایات پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے القاء جسد سے مراد حضرت سلیمانؑ کا شدت مرض میں جسم بے روح کی طرح تخت پر پڑ جانا اور ثم اناب سے صحت یاب ہو جانا مراد لیا ہے(۴۳) وادی نملہ میں (جو ابن بطوطہ کے مطابق عسقلان اور یاقوت کے مطابق بیت جبرون و عسقلان کے درمیان کی وادی اور عام مفسرین کے مطابق شام کا علاقہ ہے) چیونٹیوں کی گفتگو سن کر مسکرانے والے واقعہ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ قرآن کے مطابق ان کو علم منطق الطیر کا جو علم عطا ہوا تھا اس کا علمی اظہار ہو جائے تاکہ مخاطب کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا تردد اور شک نہ ہو (۴۴) اس میں احمد زکی پاشا نے نملہ سے انسانوں کا انبوہ کثیر مراد لیا ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ اگر یہ معاملہ انسانوں کے انبوہِ کثیر سے متعلق ہوتا تو قرآن کو ایسے صاف اور سادہ معاملہ کو پیچیدہ کنایہ اور اشارہ میں بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، (۴۵) ملکۂ سبا کے قبول اسلام (۴۶) اور حضرت سلیمانؑ سے نکاح کے متعلق لکھتے ہیں کہ کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا سے نکاح کر لیا، اس کو اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دے دی اور گاہے گاہے اس سے ملاقات کو جاتے رہے، لیکن قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔(۴۷)

حضرت ایوبؑ کے متعلق ان کی شخصیت، ان کے نام یوباب اور ایوب، ان کے عہد، ان

کے عہد کے علمائے یہود ونصاریٰ، قرآن میں واقعہ ایوب کی تفصیلات، بعض غلط فہمیوں کا ازالہ، چند تفسیری حقائق، سفر ایوب، وفات اور بصائر کو موضوع بنا کر تحقیق کی گئی ہے اور حسب معمول بصائر و عبر کا التزام کیا ہے۔(۴۸)

حضرت یونسؑ کے سلسلہ میں ان کے نسب، ان کے عہد کا تعین، مقام دعوت، چند تفسیری مباحث، متنبی کاذب کی تلبیس، وفات اور موعظت کے عنوان سے بحث ہے، حضرت یونسؑ باشندگانِ نینوا کی جانب مبعوث ہوئے تھے، جن کا طرز حکومت قبائلی تھا، قرآن کے مطابق اس وقت وہاں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ، حدیث مرفوع اور مجموعہ تورات میں صحیفہ یونس کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار تھی، تاہم عبداللہ ابن عباس، سعید بن جبیر اور مکحول کے مطابق ایک لاکھ دس سے ستر ہزار تھی، مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔ قوم یونس سے رسوا کن عذاب ٹال دینے کے مسئلہ کے متعلق قرآنی تشریحات میں(۴۹) انہوں نے جمہور مفسرین کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔ مولانا نے جھوٹے مدعی نبوت غلام احمد قادیانی کی بھی خبر لی ہے۔(۵۰) اسی ضمن میں مولانا نے فضیلت یونس و فضائل انبیاء پر بڑی نکتہ آرا بحث کی ہے۔(۵۱)

ذوالکفل کے متعلق ابن کثیر نے مجاہد سے ایک مفصل روایت نقل کی ہے، مولانا کے بقول یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے محل نظر اور درایت کے لحاظ سے نا قابل حجت ہے۔(۵۲)

حضرت عزیرؑ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کا قرآن میں صرف ایک جگہ نام آیا ہے۔ اس کے باوجود مولانا نے مختلف عناوین سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ سورۂ کہف کے تفسیری فوائد لکھتے ہوئے مولانا آزاد نے سورۂ بقرہ میں مذکور واقعہ کو حضرت حزقیل کا مکاشفہ قرار دیا ہے، مولانا سیوہاروی نے اس ضمن میں اس کا رد کیا اور لکھا کہ ”مولانا آزاد کی یہ تاویل تاویل باطل ہے“۔(۵۳)

حضرت زکریاؑ کے بیان میں قرآن اور صحیح احادیث میں وارد واقعات پر ہی اعتبار کیا گیا ہے، اسرائیلی روایات کو مولانا ساقط الاعتبار ثابت کیا ہے۔(۵۴)

حضرت یحییٰؑ کے تذکرہ پر جلد دوم ختم ہوتی ہے۔(۵۵)

(باقی)

حواشی

(۱) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، ص ۳۶۸، اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس، لاہور ۲۰۰۱ء۔ (۲) ایضاً، ص ۶۷۔ (۳) قصص القرآن، جلد اول، ص ۸، لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج دہلی، باردوم ۱۹۷۰ء۔ (۴) سن تصنیف کے سلسلہ کی یہ معلومات ان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشنوں کے پیش لفظ سے ماخوذ ہیں۔ (۵) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، ص ۳۴۸۔ (۶) قصص القرآن، جلد اول، ص ۵۔۶۔ (۷) ایضاً، حصہ دوم، ص ۶، طبع نہم، دسمبر ۱۹۶۹ء، جمال پریس، دہلی۔ (۸) ایضاً، ص ۷۔ (۹) قصص القرآن حصہ سوم، طبع دہم، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۷، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی۔ (۱۰) جلد چہارم، طبع ہشتم ۱۹۷۰ء، ص ۷، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی۔ (۱۱) بحوالہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، ص ۲۷۔ (۱۲) ایضاً، ص ۵۳۔ (۱۳) ایضاً، ص ۳۵۸۔ (۱۴) جلد اول، ص ۳۵۔۳۵۔ (۱۵) تفصیل کے لیے دیکھیں جلد اول، ص ۳۵۔۳۶۔ (۱۶) ایضاً، ص ۵۶ تا ۵۸۔ (۱۷) جلد اول، ص ۸۷۔۸۸۔ (۱۸) ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۱۔ (۱۹) ایضاً، ص ۱۵۳۔ (۲۰) دیکھیے جلد اول، ص ۱۵۴ تا ۱۶۷۔ (۲۱) ایضاً، ص ۱۹۷۔ (۲۲) قصص القرآن، جلد ۱، ص ۲۵۵۔ (۲۳) ایضاً، ص ۲۶۸۔ (۲۴) قصص القرآن، ج ۱، ص ۳۴۲۔ (۲۵) ایضاً، ص ۲۹۳۔ (۲۵) ایضاً، ص ۳۴۶۔ (۲۷) ایضاً، ص ۳۴۶۔ (۲۸) ایضاً، ص ۴۲۸۔۴۲۹۔ (۲۹) جلد اول، ص ۴۲۸۔۴۲۹۔ (۳۰) ملاحظہ ہو، ص ۵۴۳ تا ۵۴۶۔ (۳۱) ایضاً، ص ۵۴۷۔ (۳۲) جلد اول ص ۵۶۴ تا ۵۷۲۔ (۳۳) دیکھیے جلد دوم ص ۱۰ تا ۱۷، جمال پریس دہلی، طبع پنجم، دسمبر ۱۹۶۹ء۔ (۳۴) ایضاً، ص ۱۷۔ (۳۵) ایضاً۔ (۳۶) دیکھیے جلد دوم، ص ۲۰، جمال پریس دہلی، طبع پنجم، دسمبر ۱۹۶۹ء۔ (۳۷) ایضاً، ص ۲۲ تا ۲۳۔ (۳۸) ایضاً، ص ۲۸ تا ۳۳۔ (۳۹) ایضاً، ص ۳۳ تا ۳۴۔ (۴۰) ملاحظہ: ص ۴۱ تا ۴۵۔ (۴۱) ایضاً، ص ۸۷۔ (۴۲) تفصیل ۱۱۰ تا ۱۱۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۴۳) دیکھیے، ص ۱۱۷۔ (۴۴) ایضاً، ص ۱۲۵۔ (۴۵) ایضاً، ص ۱۲۷۔ (۴۶) ایضاً، ص ۱۵۴۔ (۴۷) ایضاً، ص ۱۵۶۔ (۴۸) ایضاً، ص ۱۹۴۔۱۹۵۔ (۴۹) ایضاً، ص ۲۱۰۔ (۵۰) دیکھیے، ص ۲۱۲۔۲۱۳۔ (۵۱) ۲۱۷ تا ۲۲۲۔ (۵۲) ایضاً، ص ۲۲۸۔ (۵۳) ایضاً، ۲۴۲۔ (۵۴) دیکھیے، ص ۲۴۹ سے ۲۶۱۔ (۵۵) ایضاً، ص ۲۷۴۔

اخبار علمیہ

”چین میں بائبل اور قرآن کی کتابت“

چین میں ایغور مسلمانوں پر ظلم، جبر واستحصال کی حقیقت اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ۲۰۱۷ء سے ان کو کیمپوں میں محروس ومحبوس کر کے ان پر ہر قسم کے تشدد واذیت رسانی کو روا رکھا جارہا ہے۔ ان مقہور ومجبور مسلمانوں کی تعداد دس لاکھ بتائی جارہی ہے جو ترک زبان بولتے ہیں۔ پوری دنیا میں اس کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے۔ گذشتہ دنوں مارچ میں انقرہ میں چین کے ایغور کیمپ کو ”انسانیت کے لیے انتہائی شرمناک“ قرار دیا گیا اور بین الاقوامی برادری سے ان کی مدد کی گہار لگائی گئی ہے لیکن ترکی حکومت کا رویہ اس معاملہ میں بہت اطمینان بخش نہیں ہے۔ حکومت کے ان مظالم کے ساتھ ساتھ یہ خبر دل کو پارہ پارہ کرگئی کہ بیجنگ میں بائبل اور قرآن کی پھر سے کتابت کرائی جارہی ہے اور ان سے ان موضوعات ومضامین اور آیات کو خارج کرنے کا پروگرام ہے جو چین کی کمیونسٹ پارٹی کے ملحدانہ نظریات وافکار اور اس کے اس منصوبہ کے خلاف ہیں جس کا انہوں نے ”قدیم مذہبی تشخص میں وسیع انقلاب“ کا نام دیا ہے۔ قرآن وبائبل کی پھر سے کتابت کا حکم کمیٹی فار ایتھک اینڈ افیئرس آف دی نیشنل کمیٹی آف دی چائنیز پولیٹکل کنسلٹیٹو کانفرنس کی جانب سے منعقد کی گئی مجلس میں دیا گیا تھا۔ یہ وہی تنظیم ہے جو چین میں اخلاقی ومذہبی امور ومعاملات کی نگراں ہے۔ (انگریزی ہفت روزہ، ریڈینس، ۵ تا ۱۱/ جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۳۲، نئی دہلی)

”یادداشت کے عصبی خلیوں کی شناخت“

طبی ماہرین نے انسانی دماغ میں موجود ان عصبی خلیوں (Neurons) کی پہچان کرلی ہے جو یادِ ماضی کو اجاگر کرنے میں انسانی دماغ کی مدد کرتے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے اسکول آف انجینئرنگ اینڈ اپلائیڈ سائنس کے محققین نے ان افراد کو اس مطالعہ میں شامل کیا جن کے دماغ کا آپریشن ہونا تھا، سرجری کے دوران مریضوں کے دماغ میں برقیرے (Electrode) نصب کیے اور جیسے ہی ان مریضوں کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی گئی تو ان الکٹروس نے سگنل کے ذریعہ عصبی خلیوں کو نشان زد کردیا۔ اس تحقیق کے روح رواں سلمان ابی قاسم کا کہنا ہے کہ نیورون انسانی دماغ میں پرانی یادوں کو نمایاں

کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس تحقیق کی کامیابی کی صورت میں نسیان کے مرض میں مبتلا افراد کا علاج آسان ہوسکتا ہے۔(اردو سائنس، ماہنامہ، نئی دہلی، دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۳۳)

''نئی دنیا کی دریافت کا دعویٰ''

امریکی خلائی ادارہ ناسا نے زمین کے سائز کی ایک ''نئی دنیا'' دریافت کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ سورج سے ۴۰ فیصد چھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ کم گرم اور زمین سے ۱۰۰ ارنوری سال کی دوری پر خلا میں موجود ہے۔اس پر پانی اور ہوا کی موجودگی کا امکان بھی سائنس دانوں نے ظاہر کیا ہے۔اس کو سیٹلائٹ ''ٹیس'' کی مدد سے دریافت کیا گیا ہے۔رپورٹ کے مطابق یہ زمین سے ۲۰ فیصد بڑا ہے اور ۳۷ دن میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرلیتا ہے۔سورج سے زمین کو پہنچنے والی توانائی کے بالمقابل اس کو ۸۶ فیصد توانائی زیادہ حاصل ہوتی ہے۔اس کا ایک رخ مسلسل بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔متعدد ماہرین فلکیات جدید آلات کی مدد سے اس کے متعلق مزید معلومات اور اعداد و شمار حاصل کرنے کے لیے اس کا مشاہدہ کریں گے۔فرانس کی خبر رساں ایجنسی ''اے ایف پی'' کے حوالہ سے اس کے متعلق رپورٹ میں درج ہے کہ ریاست ہوائی کے شہر ہونولولو میں امریکن ایسٹرونومیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں ناسا کی ''جیٹ پروپلشن لیباریٹری'' کی جانب سے بتایا گیا ہے کہ اس کو ''ٹی او آئی ٹی ۷۰۰ ڈی'' کا نام دیا گیا ہے۔اس کی موجودگی کی تصدیق ''اسپیٹزر اسپیس ٹیلیسکوپ'' سے بھی کی گئی ہے۔اس سے قبل ''کیپلر اسپیس ٹیلیسکوپ'' کی مدد سے بھی کئی ایک سیارے دریافت کیے جاچکے ہیں لیکن ٹی ایس ایس (ٹیس) کی یہ پہلی دریافت ہے، اس سیٹلائٹ کو ۲۰۱۸ء میں خلا میں روانہ کیا گیا ہے۔زمین کے حجم والے ستاروں کی تلاش کے لیے خاص طور پر اس کو تیار کیا گیا ہے۔ستاروں کے سامنے سیاروں کے آنے سے اس کی روشنی مدھم ہوجاتی ہے۔اس سے ٹیس کو کسی سیارے کی موجودگی، اس کے حجم اور اس کے مدار کا اندازہ ہوجاتا ہے۔(راشٹریہ سہارا لکھنؤ، ۸ جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۱۲)

''العلا حجر سے ماہرین آثار قدیمہ کی دلچسپی''

ماہرین آثار قدیمہ کی ایک ٹیم سعودی عرب کے آثار قدیمہ کے متعلق معلومات جمع کرنے

کے لیے ملک گیر جائزہ لے رہی ہے۔ العلاء نامی ریت کا صحرا جو پتھروں سے بھرا ہوا ہے، ماہرین کے لیے پسندیدہ خطہ بن گیا ہے۔ اس خطہ میں ۱۰۰ ق م قبل مسیح میں نوبتین تہذیب کی نشو و نما ہوئی اور تقریباً ۲ سو برس تک یہ ثقافت یہاں پھلی پھولی اور آباد رہی۔ نوبتین حکمرانوں نے پیڑا نامی شہر کو اردن میں دارالحکومت بنایا اور العلا حجر میں انہوں نے دوسرا دارالحکومت بنایا۔ اس وقت یہ علاقہ مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ بیلجیم جتنے بڑے رقبہ والے اس خطہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے لیے ۶۰ ماہرین کی ایک بین الاقوامی ٹیم نے ابتدائی سطح پر کام کا آغاز کر دیا ہے جس میں وہ سعودی عرب کے شمالی مغربی علاقہ میں نوبتین تہذیب کے مرکزی علاقہ کے سوا تین ہزار مربع کلومیٹر رقبہ کا جائزہ لیں گے۔

(اخبار مشرق، نئی دہلی، ۸ جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۶)

''عالمی آزادی صحافت پر ایک تازہ رپورٹ''

انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ، ویانا کی جانب سے جاری کی جانے والی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صحافیوں کی اموات میں نمایاں کمی کے باوجود ۲۰۱۹ء میں عالمی آزادی صحافت کے بحران میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومتیں قانونی طور پر صحافیوں اور آزاد ذرائع ابلاغ کو خاموش، انہیں ہراساں کرنے اور ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے آن لائن حملوں میں اضافہ کی جانب مائل ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ قوانین کا غلط استعمال کر کے انہیں جیل بھیجنے، آزاد صحافیوں کی ساکھ خراب اور صحافت کو کمزور کرنے کے لیے بیان بازی کا رجحان بھی بڑھتا ہوا دیکھنے میں آ رہا ہے۔ آئی پی آئی کی ڈائریکٹر باربرا ٹریونفی کا کہنا ہے کہ ہم صحافیوں کے قتل کی تعداد میں نمایاں کمی کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ہمیں خدشہ ہے کہ یہ کئی ممالک میں آمرانہ رجحانات کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ دنیا بھر میں حکومت نے قومی سلامتی، جعلی خبروں اور نفرت انگیز تقاریر کے خاتمہ کے نام پر نئے قوانین نافذ کیے اور نائجیریا، کمبوڈیا اور سنگاپور میں اس حوالے سے قانون سازی ہوئی اور دیگر ممالک میں میڈیا اور صحافیوں کو ہراساں اور بدنام کرنے کے لیے سوشل ذرائع ابلاغ کا سہارا لیا گیا۔ (انقلاب وارانسی، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۰)

(ک۔ ص۔ اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب پاکستان

مرکز حمایة المخطوطات العربیة
E-mail: mss.himayah@gmail.com

۲۶/ دسمبر ۲۰۱۹ء

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندویؒ (۱۹۱۱ء-۱۹۸۹ء) مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ہم عصر اور ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ندیم (گیا) روزنامہ رہبر (حیدرآباد دکن) اور ہفت روزہ البلاغ (حیدرآباد دکن) کے ایڈیٹر/سب ایڈیٹر بھی رہے، ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک حیدرآباد دکن میں سیاست اور صحافت میں خوب ایکٹو زندگی گزاری۔ نواب بہادر یار جنگ کے دست راست رہے۔ تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ انجمن اتحاد المسلمین (حیدرآباد) کے چیف سکریٹری اور اس تحریک کے سرگرم کارکن، نواب بہادر یار جنگ کے تحریر وتقریر کے ساتھی تھے۔ ہاشمی صاحب کی وفات پر ''معارف'' مئی ۱۹۸۹ء میں ان کا ہلکا سا ذکر آیا ہے۔

وہ علمی میدان میں عربی مخطوطات کے ماہر تھے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ کی خدمات میں سرگرم رکن تھے۔ مولانا محمود حسن ٹونکی کی ''معجم المؤلفین'' میں مولانا کے ساتھی تھے۔ دائرۃ المعارف کے ملازم رہے اور اس کے علمی اجتماعات میں بھرپور حصہ لیا۔ عربی زبان وادب کے شناور تھے۔ بلا کا حافظہ پایا، علوم وفنون کے ماہر، جس مجلس میں جس علم سے متعلق کوئی بحث ہوتی اس میں سب سے آگے اور حاوی ہوتے تھے، عربی مخطوطات کے علم میں ہم نے کسی کو ان سے بڑھ کر نہ پایا۔ سیاست وصحافت کے میدان میں ممتاز کردار کے حامل رہے، سن ۱۹۴۸ء میں ریاست کی طرف سے بھیجے گئے عرب ممالک کے لیے وفد کے سربراہ یا اہم رکن تھے۔

ان کے اس عرصے کی سرگرمیاں یقیناً حیدرآباد دکن سے متعلق ادب ولٹریچر میں نمایاں طور پر مذکور ہوں گی، عین ممکن ہے کسی نے خصوصی طور پر ان صاحب کو موضوع سخن بنایا ہو، ان جملہ تحریرات سے بالکل بے خبر ہوں۔

ان صاحب کی رفاقت میں میری زندگی کے عمدہ دس بارہ سال گزرے ہیں، انہوں نے

میری درخواست پر اپنے مقالات اور کتب کی لمبی فہرست مجھے لکھوائی تھی جو ۳۰۰ مقالات اور ۳۰ سے زائد کتب پر مشتمل ہے، ان کے بارے میں کافی میٹریل میں نے جمع کر لیا ہے لیکن حیدرآباد دکن کے عرصہ سے متعلق اندھیرے میں ہوں۔

اس عرصے کا میٹریل میرے لیے ان کی سوانح عمری مرتب کرنے میں کافی مدد اور معاون ثابت ہوگا، جس کے لیے حیدرآباد سے کسی ایسے صاحب علم کی مدد درکار ہے جو صحافت یا علمی میدان سے وابستہ ہو، وہ صاحب میرے اس کام میں برابر کے شریک شمار کیے جائیں گے۔

میری متواضع خدمات کا تعارف ''معارف''، اعظم گڑھ کے شمارہ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں ایک انٹرویو کی صورت میں موجود ہے، عربی زبان اور عربی مخطوطات کی خدمت میں میں نے ایک طویل زندگی صرف کی ہے، اس وقت چھیاسیویں سال کے لپیٹے میں ہوں۔ مجھ پر مولانا ہاشمی صاحب کی سوانح تحریر کرنے کا قرض ہے جو آخر عمر میں اتارنے میں مصروف عمل ہوں۔

ڈاکٹر احمد خان

مکتوب علی گڑھ

فیکلٹی آف تھیالوجی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۵/جنوری

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

معارف کے شمارہ جنوری ۲۰۲۰ء میں پروفیسر محمد یٰسین صدیقی صاحب کا مقالہ ''حافظ مغلطائی کی کتاب الزہر الباسم فی سیر ابی القاسم'' شائع ہوا ہے۔ محترم مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

> ''مصادر سیرت نبویؐ کی تلاش و انتخاب کے ایک طویل صبر آزما اور پیچیدہ عمل کے دوران حافظ مغلطائی کی ایک ضخیم کتاب کا پتہ چلا، مشہور کتابیات نگار سیرت و قرآن صلاح الدین المنجد کی ''معجم ما الف عن رسول اللہ ﷺ'' میں اس کے واحد مخطوطہ کا سراغ محکم ملا، وہ مشہور عالم کتب خانہ لائیڈن میں مخطوطہ نمبر ۸۶۴ کے

نمبر اندراج کے ساتھ محفوظ ہے............

مخطوطہ واحدہ ہونے کے سبب اس کے حصول و مطالعہ و شمول کی بڑی حسرت تھی لیکن وہ تلاش بسیار اور کوشش فراواں کے باوجود خاکسار کے ہاتھ نہ لگ سکا، خوش قسمتی سے وہ ایک اور عاشق سیرت نبوی اور کتابوں کے رسیا مفتی محمد سعید خاں، اسلام آباد کو میری نشان دہی پر میسر آ گیا۔ مفتی موصوف نے اسے اپنے ایک عزیز معاون ونگراں کتب خانہ مولانا احسن احمد عبدالشکور سے مرتب و محقق کرا کے جمہوریہ مصر کے مکتبہ دارالسلام قاہرہ سے ۱۴۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء میں دو جلدوں میں شائع کرادیا''۔

عرض یہ ہے کہ پروفیسر صدیقی صاحب کو یہ محنت شاقہ کی زحمت اس لیے اٹھانی پڑی کہ ان کو کتاب کے مطبوعہ ہونے کی اطلاع نہیں ملی۔ مفتی محمد سعید خاں صاحب کو اور محقق مولانا احمد احسن عبدالشکور کو بھی الزھر الباسم فی سید ابی القاسم کے مطبوعہ ہونے کی خبر نہ ہوئی، ورنہ یہ حضرات اس زحمت میں نہ پڑتے اور کثیر مالی رقم خرچ بھی نہ کرتے۔

گذشتہ دنوں میں ''رسول کریمؐ کے مصائب'' پر کام کررہا تھا۔ اس کتاب کی تیاری کے دوران مجھے حافظ مغلطائی حنفی کی مذکورہ کتاب کا مطبوعہ نسخہ ملا۔ یہ نسخہ مفتی محمد سعید خاں صاحب کی اشاعت سے بارہ سال پہلے یعنی ۲۰۰۰ء مطابق ۱۴۲۱ھ میں شائع ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر خمیس بن صالح بن الغامدی نے اسے ایڈٹ کیا ہے اور اسے جامعۃ ام القریٰ وزارۃ التعلیم العالی، المملکۃ العربیۃ السعودیہ نے شائع کیا ہے۔ محقق موصوف نے ایک طویل مقدمہ حافظ مغلطائی کی شخصیت اور خدمات حدیث وسیرت پر اور الزہر الباسم کی تلاش و تحقیق پر رقم کیا ہے۔ کتاب مکہ مکرمہ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ISBN No: 20102000003637 کے ساتھ نٹ پر بھی موجود ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ فاضل مقالہ نگار مولانا احمد عبدالشکور اور ڈاکٹر خمیس بن صالح کی تحقیق وتعلیق کا موازنہ کرتے اور اپنی فاضلانہ رائے ظاہر کرتے۔ اس سے سیرت کی کتابوں کی تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی ہوتی۔

والسلام

محمد سعود عالم قاسمی

وفیات

ڈاکٹر مراد ہوفمین

اشتیاق احمد ظلی

مشہور اسلامی اسکالر اور مصنف ڈاکٹر مراد ہوفمین کا ۱۳؍جنوری ۲۰۲۰ء کو بون، جرمنی میں انتقال ہوگیا۔ وہ جرمنی کے ایک ممتاز سفارت کار تھے۔ انھوں نے بڑے امتیاز سے اپنی مفوضہ خدمات انجام دیں اور اپنے وطن کی شہرت اور نیک نامی کے لیے کام کیا۔ ان کا نام ولفریڈ ہوفمین (Willfried Hofmann) تھا۔ انھوں نے اپنا اسلامی نام مراد رکھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے مصنف اور خطیب تھے اور انھوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو بھرپور طور پر اسلام کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔ مغربی دنیا میں انھوں نے اسلام کے دفاع اور تعارف کی ذمہ داری کو بہت اچھی طرح ادا کیا۔ خاص طور سے نائن الیون کے حادثہ کے بعد ان کی خدمات کی اہمیت اور دائرہ کار دونوں میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ اس پس منظر میں اسلاموفوبیا سے بری طرح متاثر مغربی دنیا میں انھوں نے بڑی سمجھداری اور پامردی سے اسلام کا تعارف بھی کرایا اور اس کے خلاف کیے جانے والے اعتراضات کا مؤثر طور پر جواب بھی دیا۔ اس خدمت کے لیے مکمل طور پر یکسو ہوجانے کے مقصد سے انھوں نے قبل از وقت سروس سے ریٹائرمنٹ لیا اور پھر اسی کام کے ہو رہے۔ اپنی کتابوں اور مضامین سے انھوں نے اسلام کی ابدی اور لازوال تعلیمات سے مغربی معاشرہ کو صرف روشناس ہی نہیں کیا بلکہ اسلام کو انھوں نے مستقبل کے لیے تنہا متبادل کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے پوری قوت اور صراحت سے یہ بات کہی کہ انسانیت کو درپیش مسائل کا حل صرف اسلامی تعلیمات میں موجود ہے اور وہ مختلف نظریہ ہائے حیات کی طرح ایک اور متبادل نہیں ہے بلکہ وہ تنہا متبادل ہے۔

ولفریڈ ہوفمین ۶ جولائی ۱۹۳۱ء کو جرمنی کے شہر Aschaffenburg میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک عیسائی کیتھولک گھرانے سے تھا۔ انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں میونخ

یونیورسٹی نے انہیں قانون میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی۔انہوں نے نیویارک اور ہارورڈ میں بھی تعلیم حاصل کی۔امریکہ میں قیام کے دوران ۱۹۵۱ء میں وہ کار کے ایک حادثہ میں بری طرح زخمی ہوگئے تھے۔صحت یاب ہونے کے بعد ان سے ڈاکٹر نے کہا کہ اس طرح کے حادثوں میں عام طور پر لوگ بچ نہیں پاتے،شاید خدا نے آپ کو کسی خاص کام کے لیے بچایا ہے۔مدتوں بعد جب وہ نعمت اسلام سے مشرف ہوئے اور مغربی دنیا میں ان کو اللہ کے دین کی خدمت کا موقع ملا تب ان کو اندازہ ہوا کہ ان کو اسی کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا تھا۔

انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس میدان میں ان کو اپنے دل و دماغ کی تسکین کا سامان نہیں ملا۔ جنگ عظیم دوم کو ابھی ختم ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔اس جنگ کے جو اثرات بد جرمنی پر پڑے تھے ان کے آثار ابھی ہر طرف موجود تھے۔اس کے نتیجہ میں اقوام عالم کے درمیان جرمنی کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ڈاکٹر ہوفمین نے سفارت کاری کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ اقوام عالم کے درمیان اپنے عزیز وطن کے وقار کو بحال کرنے کے لیے کام کر سکیں۔ انہوں نے پہلے ناٹو کے تحت نیوکلیر ڈیفنس کے ایکسپرٹ اور انفارمیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد وہ ۱۹۶۱ء سے باقاعدہ سفارت کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں ان کو الجیریا میں جرمنی کا سفیر مقرر کیا گیا۔ یہاں انہوں نے قریب چار سال تک بحیثیت سفیر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۰ء میں ان کو مراکش میں سفیر مقرر کیا گیا جہاں انہوں نے ۱۹۹۴ء تک کام کیا۔اگلے سال ۶۳ سال کی عمر میں انہوں نے قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لیا اور اپنی تمام تر توانائیوں کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ملازمت کے دوران ہی انہوں نے ۱۹۸۰ء میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں مسلمان ملکوں میں انہوں نے بحیثیت مسلمان سفارت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔

جب ان سے قبول اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جانے والے کے لیے یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔دوسری جگہوں پر انہوں نے اپنے قبول اسلام کے لیے بعض اسباب کا ذکر کیا ہے۔جب وہ پہلی مرتبہ الجیریا گئے تو اس وقت وہاں آزادی کی جدو جہد اپنے شباب پر تھی۔وہاں انہوں نے الجیریا

کے باشندوں کے خلاف فرانس کے ظلم و جبر کے بڑے تکلیف دہ مناظر دیکھے۔ قتل اور انتہائی درجہ کی اذیت رسانی روزمرہ کی بات تھی۔ اس ظلم و جبر کو الجیریا کے باشندے جس صبر و ضبط سے برداشت کرتے تھے وہ ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا۔ جب انہوں نے اس غیر معمولی قوت برداشت کے پیچھے کارفرما اسباب و عوامل کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ اس کا سرچشمہ دراصل ان کا مذہب تھا۔ فطری طور پر انہوں نے اس مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ان کو قرآن مجید تک لے گئی۔ اس کے نتیجہ میں ان کا اس کتاب حکیم سے ایسا گہرا رشتہ استوار ہوا جو زندگی بھر قائم رہا اور دراصل یہی ان کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا۔ مسلمانوں کی اس غیر معمولی قوت برداشت کا راز ان کو استعینوا بالصبر والصلوٰۃ کی قرآنی تعلیم میں نظر آیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دراصل اسی قرآنی تعلیم کا اثر تھا۔ انہوں نے قرآن کا ایک اور معجزہ دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ لوگ بھی قرآن کو آسانی سے حفظ کر لیتے ہیں جو عربی زبان سے یکسر نابلد ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ قرآن کا کھلا ہوا معجزہ تھا کیوں کہ کسی ایسی زبان کی عبارت یاد کرنا ممکن نہیں جس سے آدمی واقف نہ ہو۔ قرآن سے یہ تعلق اور اس پر غور و فکر بالآخر ان کے قبول اسلام پر منتج ہوا۔

ڈاکٹر ہوفمین بہت اعلیٰ درجہ کے ذوق جمالیات کے حامل تھے۔ اسلامی فن تعمیر اور خطاطی میں ان کو جمالیاتی پہلو بہت ترقی یافتہ شکل میں نظر آیا۔ خاص طور سے اسپین کے سفر میں وہاں کی مسجدوں اور محلات میں ان کو اپنے ذوق جمالیات کی تسکین کا بہت کچھ سامان ملا۔ یہ چیز بھی کسی حد تک اسلام سے قربت کا ایک ذریعہ بنی۔

قرآن مجید کی تعلیمات اور مطالب سے جیسے جیسے ان کی واقفیت بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کو مسیحی عقائد کے تضادات زیادہ واضح طور پر محسوس ہونے لگے اور پیدائشی گناہ اور کفارہ کے تصورات ذہنی الجھن کے باعث بننے لگے۔ یہ مسئلہ ناقابل فہم نظر آنے لگا کہ اس گناہ سے نجات کے لیے کفارہ کے طور پر خدا کے بیٹے کو مصلوب ہونا پڑا۔ جب ان کی نظر سورۃ النجم کی آیت ۳۸ ''لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' پر پڑی تو ان کے سامنے پوری صورت حال واضح ہوتی چلی گئی۔

اس کے علاوہ مشہور اسلامی اسکالر محمد اسد اور دوسرے مسلمانوں سے تعلقات بھی کسی حد تک

اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوئے اور وہ ذہنی طور پر اسلام سے قریب ہوتے چلے گئے۔ بالآخر اپنے طویل غور وفکر کے نتائج کو انہوں نے سپرد قلم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریر جو ۱۲ رصفحات پر مشتمل تھی انہوں نے خاص طور سے اپنے بیٹے کی اٹھارویں تاریخ پیدائش کے موقع پر اسی کو دینے کے لیے لکھی تھی۔ اس تحریر میں انہوں نے جو باتیں لکھی تھیں ان کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ فلسفہ کی کسوٹی پر پوری اترتی تھیں اور ان میں شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس مسودہ کو انہوں نے کولون (Cologne) کی مسجد کے امام محمد احمد رسول کو اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ اسے دیکھنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ ان باتوں کا لکھنے والا اگر ان باتوں پر یقین بھی رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہے۔ چند دنوں بعد ہی ڈاکٹر ہوفمین نے اسلام قبول کرلیا۔ گواہ کے طور پر وہ اپنے ساتھ (لیو پولڈ) محمد اسد کو لائے تھے۔ قبول اسلام کے بعد انہوں نے وزارت خارجہ میں پندرہ سال مزید ملازمت کی۔ سفیر کی حیثیت سے ان کی دونوں تقرریاں اس کے بعد ہی ہوئیں۔ انہیں نہ صرف یہ کہ اپنے پیشہ ورانہ کیریر میں کسی طرح کے امتیازی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انہیں اوارڈ سے بھی نوازا۔ چنانچہ اسلام قبول کرنے کے ڈیڑھ سال بعد ہی جرمن صدر Dr.Carl Castens نے انہیں آرڈر آف دی میرٹ آف دی فیڈرل ریپبلک آف جرمنی کے باوقار ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ان کی کتاب ڈائری آف اے جرمن مسلم کو مسلم ممالک میں واقع اپنے تمام سفارت خانوں کو خصوصی مطالعہ کے لیے ارسال کیا۔

۱۹۹۵ء میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسلام کی خدمت کے لیے پوری طرح فارغ ہوجائیں۔ گذشتہ ربع صدی کا پورا عرصہ انہوں نے اپنے اسی مشن کی تکمیل میں گزارا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف اور خطیب تھے اور ان کی یہ صلاحیتیں خدمت اسلام کے لیے وقف تھیں۔ مغرب میں اسلام کے دفاع اور تعارف کا کام انہوں نے بہت اچھی طرح انجام دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں، معیاری مجلّات میں بے شمار مضامین لکھے، تقریریں کیں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ غرض ہر وہ کام کیا جس کی اس مقصد کے حصول کے لیے ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یوروپ اور دنیا کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے،

چنانچہ انہوں نے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی طرف خصوصی توجہ دی جو مغرب میں اسلام کے سلسلہ میں پائی جاتی تھیں اور جس میں نائن الیون کے حادثہ کے بعد بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ مغربی معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ ان باتوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے جو مغربی ذہن کے لیے الجھن کی باعث بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس میدان میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

انہوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: فیوچر آف اسلام ان دی ویسٹ اینڈ ایسٹ، اسلام دی آلٹرنیٹو، ریلیجن آن دی رائز: اسلام ان دی تھرڈ ملینیم، جرنی ٹو مکہ، اسلام اینڈ قرآن، اسلام ان دی ویسٹ، اسلام ۲۰۰۰ء، فلاسوفیکل پاتھ وے آف اسلام، جرنی ٹو اسلام: ڈائری آف اے جرمن ڈپلومیٹ۔ اس کے علاوہ معیاری مجلّات میں انہوں نے اپنی دلچسپی کے موضوعات پر بہت سے مقالات لکھے، جن مجلّات میں ان کے مقالات اور مضامین چھپتے رہے ان میں جرنل آف اسلامک اسٹڈیز، اسلام آباد، مسلم ورلڈ بک ریویو، لیسٹر، انگلینڈ، دی امریکن جرنل آف اسلامک سوشل سائنسز، ورجینا، انکاؤنٹر، لیسٹر اور الاسلام، میونخ شامل ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پوپ بنڈکٹ X VI نے ۱۲؍ستمبر ۲۰۰۶ء کو یونیورسٹی آف ریجنس برگ (University of Regensburg) میں ایک لکچر کے دوران حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ میں ایک بازنطینی بادشاہ کا ایک نہایت اہانت آمیز تبصرہ نقل کیا تھا۔ دنیا بھر میں مسلمانوں نے اس پر اپنے شدید غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں ۱۳؍اکتوبر ۲۰۰۷ء کو مسلمان علماء نے اہم عیسائی شخصیات کے نام ایک کھلا خط لکھا۔ یہ خط دراصل سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ میں اہل کتاب کو کلمہ سواء کی بنیاد پر جو دعوت دی گئی اسی پر مشتمل تھا۔ یہ کھلا خط ۱۳؍اکتوبر ۲۰۰۷ء کو لکھا گیا اور اس کا عنوان تھا: A Common Word Between Us and You، ڈاکٹر مراد ہوفمین ان مسلم اسکالرز میں شامل تھے جنہوں نے اس پر دستخط کیے تھے۔

ڈاکٹر ہوفمین جرمن مسلم کونسل کے ممبر اور مشیر تھے۔ ان کی شادی ایک ترک خاتون سے ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا قیام جرمنی اور ترکی دونوں جگہ رہتا تھا۔ ان کے انتقال سے یورپ کے اسلامی حلقوں میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اللھم اغفر له وارحمه وادخله فسیح جناتك۔

آثار علمیہ وتاریخیہ

علامہ سید سلیمان ندوی کا ایک قدیم ترکیب بند اور مرثیہ

☆جناب مولانا طلحہ نعمت ندوی

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کا مجموعہ "ارمغان حجاز" ہے جسے مولانا غلام محمد صاحب حیدرآبادی نے مرتب کر کے پہلی مرتبہ شائع کیا تھا لیکن اس پر کوئی تاریخ اشاعت درج نہیں ہے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے مفصل تبصرہ سے جو معارف میں شائع ہوا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں کراچی ہی سے دوبارہ اس کی اشاعت ہوئی جس پر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کا مقدمہ ہے۔ دارالمصنّفین نے ابھی پہلی مرتبہ ہندوستان سے اسے شائع کیا ہے جو دوسری اشاعت پر مبنی ہے۔

مولانا غلام محمد صاحب نے اس مجموعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ سید صاحب کا مکمل کلام نہیں، جو بیاض ان کو ملی اور جو مشہور نظمیں اور قصائد بآسانی دستیاب ہو گئے بس وہی اس میں شامل ہو سکے ہیں، انہوں نے توجہ دلائی کہ سید صاحب کے کلام کی تلاش وترتیب کا کام ابھی باقی ہے، ادھر بعض دیگر اہل علم نے راقم کو اس طرف متوجہ کیا کہ سید صاحب کے اشعار پر مستقل کام ہونا چاہیے، ارمغان سلیمان کی اشاعت کے بعد پروفیسر عبدالقوی دسنوی مرحوم نے اپنی کتاب "یادگار سلیمان" میں سید صاحب کی بہت سی ابتدائی دور کی نظمیں اور اشعار درج کیے ہیں اور بعض کے حوالے بھی دیے ہیں۔ سید صاحب پر جن اہل علم نے قلم اٹھایا ہے، ان کے پیش نظر عام طور پر ارمغان سلیمان ہی رہا ہے، جن میں تین مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، سب سے پہلا مضمون حضرت شاہ معین الدین احمد ندویؒ کا ہے جو مجموعہ کی اشاعت کے بعد معارف میں شائع ہوا تھا، اس میں مجموعہ شعر کے تعارف کے ساتھ سید صاحب کی شاعری پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن انہوں نے اس مجموعہ کے علاوہ سید صاحب کی کسی اور نظم یا شعر کا نہ کوئی ذکر کیا ہے نہ اس حوالہ سے کوئی بات کی ہے۔ اس موضوع پر دوسرا مفصل

☆استھاواں (بہار شریف)

مضمون ہمارے علم کے مطابق مولانا ڈاکٹر نعیم صدیقی کا ہے جوان کی کتاب ''سید سلیمان ندوی حیات اورادبی خدمات'' میں شامل ہے۔انہوں نے مرتب دیوان کے علاوہ شاہ صاحب کے حوالے بھی درج کیے ہیں نیز دیگر حوالے بھی ہیں لیکن ان کے یہاں بھی کوئی نیا انکشاف نہیں۔اسی لیے حضرت شاہ صاحب اوران ہی کی اتباع میں مولانا نعیم ندوی مدظلہ نے یہ لکھ دیا کہ سید صاحب کی شاعری کا پہلا نمونہ ۱۹۰۴ء کا ملتا ہے۔تیسرا مفصل مضمون جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی مرحوم کا ہے جوان کے مجموعہ مضامین ''اردوشاعری کی گیارہ آوازیں'' میں شامل ہے،ان کی تحقیق کے مطابق سید صاحب کی پہلی نظم ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ بہار بانکی پور (پٹنہ) میں شائع ہوئی تھی، دوسرے سال بھی اس رسالہ میں ایک نظم شائع ہوئی، نیز اسی سال سید صاحب کی ایک نظم ہفتہ واراخبار الپنچ بانکی پور میں بھی شائع ہوئی، پھر ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں بھی اس اخبار میں کئی مفصل قصیدے اور نظمیں شائع ہوئیں۔دسنوی صاحب نے ''یادگار سلیمان'' میں بھی ان کا ذکر کیا ہے جو شاید مذکورہ بالا مضمون کے بعد مرتب کیا گیا ہے اسی لیے اس میں رسائل میں شائع ہونے والے کلام کے ابتدائی اشعار کے ساتھ ان کا اشاریہ بھی شامل ہے نیز بعض قدیم نظمیں بھی اس میں شامل کردی گئی ہیں لیکن ماہنامہ بہار بانکی پور کی دو نظمیں اوراخبار الپنچ کا ایک مرثیہ اورایک ترکیب بند اس کتاب میں شامل نہیں،اس لیے راقم کو خیال آیا کہ ان چاروں کو کتب خانہ خدابخش میں موجود قدیم فائلوں سے نقل کر کے معارف کے حوالہ سے اہل علم کی خدمت میں پیش کردیا جائے ،ہم عبدالقوی دسنوی کی دریافت شدہ نظموں کے علاوہ سید صاحب کی کسی اور شعری تخلیق کا سراغ نہیں لگا سکے ہیں،سردست سید صاحب کی اخبار الپنچ میں شائع شدہ نظمیں،ترکیب بند اورایک قدیم مرثیہ پیش خدمت ہے،اخبار بہار میں جو اور نظمیں شائع ہوئی ہیں ان تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ترکیب بند سید صاحب نے اپنے وطن کے سالانہ اجلاس کے لیے لکھی تھیں اورمرثیہ اپنے ایک عزیز صفیر الحق بن محب الحق دسنوی کی جواں مرگی کے غم میں لکھا تھا،موصوف اس ہفتہ راو اخبار الپنچ پٹنہ کے نگراں بھی تھے،اسی لیے جس صفحہ پر یہ مرثیہ شائع ہوا ہے،وہیں مبارک عظیم آبادی کا ایک فارسی مرثیہ بھی اس نوجوان کی یاد میں موجود ہے،علامہ شبلی کے مرثیہ کے علاوہ ہمیں سید صاحب کے کسی اور مرثیہ کا علم نہیں،اس اعتبار سے مشق سخن کے دورآغاز میں کہے گئے اس مرثیہ کی اپنی جگہ اہمیت ہے، مرثیہ کی معنویت اورادبی مقام کا (وہ بھی ایک نومشق نوجوان کا) اہل ذوق خود فیصلہ کریں گے۔

ترکیب بند

از نتیجہ فکر مولوی محمد سلیمان صاحب سید دیسنوی

(برائے جلسہ سالانہ الاصلاح دیسنہ)

اے بزرگو! دوستو! پھر باغ میں آئی بہار پھر وہی ہیں چہچہے اور پھر وہی صورت ہزار
پھر ہوا آزاد مجنوں توڑ کر زنجیر پا نوک کی لیتا ہے پھر تلواروں سے (ا) مشت خارزار
جھومتی ہے ڈالیاں، غنچے مسرت بخش ہیں چھائی جاتی ہے گھٹا گلزار پر مستانہ وار
مزرعہ دل میں ہوئی سرسبز یہ کشت امید پھر کیا پیدا نہال آرزو نے برگ وبار
پھر وہی ہے انجمن، پھر وہی حضار بزم بلکہ اب کے سال زائد پہلے سے ہیں تین چار
کس کو تھی امید، ہوگی انجمن اس شان کی کون کہتا تھا نظر آئیں گے یہ نقش ونگار
پھول جھڑتے ہیں دہن سے بزم کے اوصاف میں بات لب پر آتے ہی بنتی ہے در آبدار

یہ بزرگوں کا ہے مجمع یا شعاع آفتاب
یہ صف احباب ہے یا سطر اوراق کتاب

جس نے دیکھا ہوگا پہلے آج سے دسنہ کا حال اس کے دل میں تو کبھی آیا نہ ہوگا یہ خیال
ایک دن اس چھوٹی سی بستی کا بھی چمکے گا نصیب یعنی اس قریہ میں ہوگا مجمع اہل کمال
تختہ گلزار بن جائے گی یہ بنجر زمیں ماہ کامل ایک دن ہوجائے گا بڑھ کر ہلال
جانتا تھا کون اس کو ابرنیساں کی بہار پڑتے ہی شکم صدف میں ہوں گے موتی کی مثال
کوشش وہمت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے مگر جس نے بستی کو بنایا نیر اوج کمال
مادہ میں قوم کے گر عنصر کوشش نہیں پا نہیں سکتی کبھی وہ حیز اوج کمال
شہپر کوشش کے آگے گرد ہے دام کمند عوج (کذا) علم وفضل کے ہوجائیں ہم بدر کمال

کوشش اہل ہمم ہی نے کیا جو کچھ کیا
سب اسی کی تھی کرامت آج تک جو کچھ ہوا

تا بہ منزل جا نہیں سکتا ہے کوئی قافلہ جب تلک کر لے نہ طے کوشش سے سارا راستا
سعی سلطان شہاب الدیں نے کی تسخیر ہند سعی کرتا ہی رہا گو مدتوں ہارا کیا
سعی کولمبس سے دنیا کو نئی دنیا ملی سعی طارق ہی نے چھینا تاج وتخت اسپین کا
تخم ہے اعمال انساں، کوششیں باران ہیں کب ہوا ہے کھیت بے باران و بارش لہلہا

جو کروگے آج پاؤگے وہی آئندہ تم　　گوید ایزد لیس للانسان الا ما سعیٰ

کوششیں اسلاف کی دیکھو تو چشم غور سے
تھا عرب مسکن مگر ڈیرے عجم میں ان کے تھے

دست بر سینہ تہید (؟ کذا) اظہار حالم می کنم　　درد دل گویم دگر گوں رنگ عالم می کنم
چرخ! ساکن شو، زمیں! گردش نما در بام و در　　ساعتے برحال خود امروز ماتم می کنم
اے جگر! خون شو، واے خوں! اشک شو از چشم ریز　　یاد احوال ترقی وزوالم می کنم
ماجرائے حال بدخون عرض کردن آرزو آسان (؟)　　نے بیان داستان قیصر و جم می کنم
نیست گریہ بے سبب، اے دوستاں! مجنوں نیم　　دامنم بے وجہ نے از اشکہا نم می کنم
گر ہمین است طور گردوں، بخت آرائش زنم　　صبر از فیروزی امید ماہم می کنم
سیدا! ایں گفتگو ہا چیست؟ کوش و بیخ کن　　پند پوشید مثال راز محرم می کنم

چارۂ بیمار نے فریاد و شیون کردن است
آرے استعمال داروہا روغن کردن است

آہ! اے سید صفیر الحق

چونک بھی او مست خواب زندگی　　ہے لب بام آفتاب زندگی
چشمک برق اضطراب زندگی　　لے اڑی آندھی سحاب زندگی
ایسے گرداب بلا میں اے خدا　　تا بہ کے آخر حباب زندگی
ہم کو مست جام غفلت کر دیا　　کیا کیا تو نے شراب زندگی
ہم انہیں آنکھوں سے کیا کچھ دیکھتے　　کاش اٹھتا یہ حجاب زندگی
جلوۂ کونین ان آنکھوں میں تھا　　گر نہ ہوتا یہ نقاب زندگی
تو فقط دھوکا تھا یہ خواب وخیال　　اے طلسمات شباب زندگی
تجھ سے بہتر ہے شب دیجور موت　　ڈھل کہیں اے آفتاب زندگی
آمری پیاری اجل جھگڑا چکے　　کون اٹھائے یہ عذاب زندگی

زندگی اک رشتہ کمزور ہے
ایک دن پھر موت ہے، پھر گور ہے

چھا گیا ابر الم بالائے دل کیا کروں کس سے کہوں غمہائے دل
بیکسی اس کی نہ دیکھی جائے گی آرزوؤں سے کہو بہلائے دل
اپنی قسمت میں جو تھیں یہ سختیاں ایک پتھر چاہیئے ، تھم جائے دل
جب نہ ہو آغوش میں وہ جان جاں کیوں نہ پھر نالا کرے ، چلائے دل
کوئی اس کا پوچھنے والا بھی ہو آبلے اپنے کسے دکھلائے دل
تجھ کو طول عمر کی اپنی قسم تونے کتنے اے اجل تڑپائے دل
کب مصیبت سے اسے فرصت ملی کب نہ کوہ غم رہا بالائے دل
جب بغل میں ہو نہ وہ آرام جاں کس طرح پہلو میں راحت پائے دل
ماتم زندہ دلی اس عمر میں نوجوانی میں نہ کیوں مرجائے دل

ہم صفیر مرغ باغ حب مرد
جان بدست ایزد باری سپرد

رہرو راہ عدم ہشیار ہو اپنی گہری نیند سے بیدار ہو
کیوں نہ چپ لگ جائے اس کی یاد میں لطف سے جس کی بھری گفتار ہو
غم کے آرائے سرپہ چل جائیں نہ کیوں یاد جب دل کو وہ خوش گفتار ہو
اس کا غم اپنے کریں جتنا ہے کم جس کے غم میں غیر ماتم دار ہو
جس نے کی ہو دوستوں کی دل دہی کیوں نہ اس کے غم میں حالت زار ہو
خلق جس کا دوست ودشمن سے ہو ایک کیوں نہ اس کی موت دل پر بار ہو
منتظر بیٹھے ہیں احباب وطن اے صفیراؤ بھی کیوں بیزار ہو
اے چراغ خاندان گم شدہ کیوں نہ تیری موت دل آزار ہو
اے جوان با حمیت ، باحیا تو نہ ہو سید جگر افگار ہو

تو ہی تھا بس اک نشان کارواں
وجہ تسکین دل پس ماندگاں (۴)

---

(۱) و (۲) الفاظ مٹے ہوئے تھے، سمجھ میں نہیں آسکے۔ (۳) اخبار ہفتہ وار اپنچ، بانکی پور، پٹنہ، ۲۵؍جنوری ۱۹۰۶ء، ص ۶۔ (۴) اپنچ، ۴؍فروری ۱۹۰۵ء، ص ۶۔

ادبیات

غزل

☆جناب الطاف احمد اعظمی

ٹوٹ جائے گی یہ مضرابِ وفا میرے بعد
ساز ہو جائے گا بے حرف و صدا میرے بعد

اپنے سائے سے ہر اک شخص خفا میرے بعد
اٹھ گئی رسم و رہِ لطف و عطا میرے بعد

اب تو بے جرم بھی ملتی ہے سزا میرے بعد
اور کچھ ہو گیا مفہوم خطا میرے بعد

میں تو دیتا ہوں دعا سنگ ستم کھا کر بھی
ہوں گے مغموم بہت اہل جفا میرے بعد

میں نے دنیا کو سکھائے ہیں جنوں کے آداب
کون صحرا میں لگائے گا صدا میرے بعد

تنگی دل کا مداوا تو نہیں ہے آساں
اور بڑھ جائے گا یہ شورِ انا میرے بعد

ہو گئے شہر کے سب اہل نظر بے توقیر
صحبت دل سے ہوئی عقل جدا میرے بعد

تشنہ لب ہو کے بھی کرتا ہوں ثنا ساقی کی
ختم ہو جائے گا یہ طرز وفا میرے بعد

تاج پھولوں کا سر خار مغیلاں ہے سجا
حادثہ یہ بھی گلستاں میں ہوا میرے بعد

یاد آؤں گا بہت اہل جہاں کو احمدؔ
کون آندھی میں جلائے گا دیا میرے بعد

☆ آر زیڈ، ۹۰۱۔بی، فلیٹ نمبر ۲۰۲، گلی نمبر ۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی۔

رسید کتب موصولہ

جذبۂ بے اختیار: (مشاہیر کے خطوط ساحل کے نام) مرتب: محمد رفیع الدین، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ ناگپور، مہاراشٹر۔ قیمت ۲۰۰/روپے

ترجمان القرآن الکریم: (جلد اول تا سوم) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترتیب احمد ابوسعید، اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ ہدیہ ہر جلد ۶۰۰/روپے

سچ تو مگر کہنے دو: ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، ۴۵۵، پرانی حویلی، حیدرآباد قیمت ۳۵۰/روپے

شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی: نارنگ ساقی، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، کوچہ چیلان دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت ۴۰۰/روپے

عشرت گیاوی حیات وشاعری: ڈاکٹر سید شاہد اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت ۱۹۴/روپے

عصری تعلیمی ادارے مسائل واحکام: مفتی سید باقر ارشد، مکتبہ اتحاد دیوبند۔ قیمت ۱۵۰/روپے

عورت کے حقوق وفرائض عہد قدیم وجدید میں: ڈاکٹر نعیم النساء، ایویروز اکیڈمی، علی گڑھ۔ قیمت ۳۰۰/روپے

فقہی مسالک اور حدیث نبویؐ: محمد فرید حبیب ندوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ قیمت ۲۵۰/روپے

مباحث القرآن: (جلد اول) فضل الرحمٰن اصلاحی، قاسمی، ادارہ دعوت القرآن امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۱۵۰/روپے

نقش معنیٰ: محمد رفیع الدین، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ ناگپور، مہاراشٹر۔ قیمت ۱۵۱/روپے

وہ یاد آئے بہت: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مرتب: اسامہ رشادی ندوی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔ قیمت ۴۲۵/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	//	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	//	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	//	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	//	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	//	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	//	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	//	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبد السلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	//	150/-
مکاتیب شبلی دوم	//	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
February 2020 Vol - 205 (2)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-